فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں	نعیم احمد	۴

قرآنیات

البیان: ہود ۱۱: ۱۰۰-۱۲۳ (۳)	جاوید احمد غامدی	۷

معارف نبوی

خاص لوگوں کے گناہوں کے باعث عام عذاب نازل ہونے کے بارے میں روایات	امین احسن اصلاحی	۱۵
حکمران، ائمۂ مساجد اور صحابۂ کرام	معز امجد/ شاہد رضا	۱۸

مقالات

امام فراہی کا تصور حکمت	خالد مسعود	۱۹

سیر و سوانح

حضرت عامر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ	محمد وسیم اختر مفتی	۲۷

نقطۂ نظر

بعد از موت (۲)	رضوان اللہ	۳۳

یسئلون

قرآن کی رو سے ترقی کا مفہوم	امین احسن اصلاحی	۴۱

وفیات

مولانا محمد علی جوہر	امین احسن اصلاحی	۴۴

ادبیات

شہر آشوب اسلام	شبلی نعمانی	۴۸

www.javedahmadghamidi.com
www.almawrid.org

نعیم احمد

''قرآنیات'' میں حسب روایت جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ترجمۂ قرآن ''البیان'' شائع کیا گیا ہے۔ یہ قسط سورۂ ہود (۱۱) کی آیات ۱۰۰-۱۲۳ کے ترجمہ اور حواشی پر مشتمل ہے۔ یہ خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اس میں ان حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے جو ماضی کی سرگذشتوں میں موجود ہیں۔ ان کو سنانے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے نتائج کی روشنی میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعلیم دی جائے۔ اس کے ساتھ قریش کو اپنے ملک کی تاریخ سے سبق لے کر زندگی گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے، دوسری صورت میں ان کو اس کے نتائج بھگتنے کی سرزنش کی گئی ہے۔

''معارف نبوی'' میں ''موطا امام مالک'' کی جو روایت منتخب کی گئی ہے، اس میں بیان ہوا ہے کہ آج کے دور میں کثیر تعداد میں برے لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث اگر ان پر کوئی آفت آتی ہے تو ان کے ساتھ کم تعداد میں نیک لوگ بھی اس آفت کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ان افراد کو چھانٹ کر الگ کر لیا جائے گا، البتہ نیک افراد اپنی نیکیوں کا اجر آخرت میں پائیں گے۔ ''معارف نبوی'' ہی کے تحت معز امجد صاحب کا مضمون ''حکمران، ائمۂ مساجد اور صحابۂ کرام'' شامل کیا گیا ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ حاکم وقت کی اطاعت کرو، ہر امام کی اقتدا میں نماز ادا کرو اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی صحابی کی بھی توہین سے باز رہو۔ نیز روایت کی استنادی حیثیت کو بیان کیا ہے۔

''مقالات'' کے تحت ''امام فراہی کا تصور حکمت'' کے عنوان سے خالد مسعود صاحب کا مضمون شامل اشاعت ہے۔ اس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ امام فراہی رحمہ اللہ کے مطابق حکمت اس قوت کا نام ہے جس کے باعث آدمی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس قوت کے نتائج کلام کی پختگی، اخلاق کی شایستگی اور عمدہ و بہترین ادب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

''سیر وسوانح'' کے تحت محمد وسیم اختر مفتی صاحب کے مضمون میں جلیل القدر صحابی حضرت عامر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے کم سنی میں ایمان لانے اور اپنے ہی گھر والوں کے ظلم وستم سہنے کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے

ہجرت حبشہ کے واقعے اور حالات زندگی کو بیان کیا ہے۔

''نقطۂ نظر'' میں رضوان اللہ صاحب نے اپنے مضمون ''بعد از موت'' کے دوسرے حصے میں بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے عقیدۂ تناسخ کو بیان کیا ہے۔ اس عقیدہ کے مطابق انسانی روح کو جسد خاکی سے جدا ہو جانے کے بعد کسی نئے مادی قالب میں پھونک دیا جاتا ہے جو حیوانی یا نباتاتی ہو سکتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ اس سے بھی جدا کر کے کسی تیسرے قالب میں داخل کر دی جاتی ہے۔ روح کا اس طرح ایک سے دوسرے جسم میں منتقل ہونا تناسخ یا آواگون کہلاتا ہے۔

''یسئلون'' میں مولانا اصلاحی سے پوچھا گیا یہ سوال نقل کیا گیا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں قرآن مجید کی رو سے ترقی سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد کیا مادی و سیاسی ترقی ہے یا روحانی ترقی یا دونوں؟ مولانا اصلاحی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قرآن مجید کی رو سے حقیقی ترقی وہ ہے جس میں اللہ کی بندگی حقیقی فرماں برداری و اطاعت کے ساتھ ہو۔ اسی سے تمام بنی نوع انسان کے لیے رحمت و برکت کے دروازے کھلتے ہیں۔

''وفیات'' میں ''مولانا محمد علی جوہر'' کے زیر عنوان مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا مضمون اس اشاعت میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا کی ایمان افروز تقریروں اور زور بیان کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ جو وعظ و تقریر اور جلسوں سے گریز کرتے تھے بطور خاص ان کے جلسے میں شریک ہوئے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ اسی جلسے میں، انھوں نے اپنی پہلی تقریر کی جسے سب نے بہت پسند کیا اور امام فراہی صاحب نے ان کی اس بہترین کاوش پر اپنے تفسیری رسائل کا ایک سیٹ انھیں بطور انعام دیا۔

''ادبیات'' میں ''شہر آشوب اسلام'' کے عنوان سے مولانا شبلی نعمانی کی نظم شائع کی گئی ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ریاست ہائے بلقان نے مل کر ایک ساتھ ترکی پر حملہ کیا تھا۔ اس سے ترکی نے جو عظیم نقصان اٹھایا، اس پر امت مسلمہ خون کے آنسو روئی تھی۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ هود

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡقُرٰی نَقُصُّهٗ عَلَيۡكَ مِنۡهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيۡدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ
وَلٰكِنۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَمَاۤ اَغۡنَتۡ عَنۡهُمۡ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیۡ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

یہ اِن بستیوں کی سرگذشتیں ہیں جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔[229] اِن میں سے بعض کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔[230] ہم نے اِن پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ اِنھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔ پھر تیرے پروردگار کا حکم صادر ہوا تو اِن کے وہ معبود اِن کے کچھ بھی کام نہ آئے جنھیں خدا کے سوا پکارتے تھے۔

۲۲۹؎ یہاں سے آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کو اُس سبق کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جو اُن سرگذشتوں سے اُنھیں حاصل کرنا چاہیے جو پیچھے بیان ہوئی ہیں۔

۲۳۰؎ اصل میں 'قَآئِمٌ' اور 'حَصِيۡدٌ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...'قَآئِمٌ' کی ایک مثال مصر ہے جس کے اندر سے فرعون اور اُس کی قوم کو خدا نے نکالا اور لے جا کر سمندر میں غرق کر دیا۔ مکان قائم رہ گئے، مکین ناپید ہو گئے۔ 'حَصِيۡدٌ' سے مراد قوم ہود اور قوم لوط وغیرہ کی بستیاں ہیں جن کے مکان و مکین سب ناپید ہو گئے۔ صرف کسی کسی کے کچھ آثار اپنے مکینوں کی بدبختی کی داستان عبرت سنانے کے لیے رہ گئے۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۷۰)

مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ
رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰی وَهِیَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ
لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ یَوْمٌ
مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ
اِلَّا بِاِذْنِهٖ فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّ سَعِیْدٌ ﴿۱۰۵﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا
زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ

اِن کی بربادی کے سوا اُنھوں نے اِن لوگوں کے حق میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ تیرا پروردگار جب بستیوں کو اُن کے ظلم پر پکڑتا ہے تو اُس کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ کہ اُس کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہے۔ اِس میں یقیناً اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہے جس کے لیے سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور وہ حاضری کا دن ہوگا۔[۲۳۱] ہم اُس کو بس ایک گنتی کی مدت کے لیے ٹال رہے ہیں۔[۲۳۲] جب وہ دن آجائے گا تو کوئی شخص خدا کی اجازت کے بغیر کلام نہ کر سکے گا۔[۲۳۳] پھر لوگوں میں سے کچھ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔ سو جو بدبخت ہوں گے، وہ دوزخ میں جائیں گے۔ اُنھیں وہاں چیخنا اور چلانا ہے۔[۲۳۴] وہ اُسی میں پڑے رہیں گے، جب تک

۲۳۱؎ یعنی سب کی حاضری کا دن تاکہ معاملے کے تمام فریق سامنے موجود ہوں اور جو کچھ فیصلہ سنایا جائے، پورے انصاف کے ساتھ سنایا جائے۔

۲۳۲؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ پر نبوت کا خاتمہ بجاے خود اِس بات کی علامت ہے کہ قیامت اب زیادہ دور نہیں ہے اور یہ فی الواقع ایک گنتی کی مدت ہی ہے جس کے لیے اُسے موخر کیا گیا ہے۔

۲۳۳؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اُن بے بنیاد توقعات کا خاتمہ ہو جائے جو لوگ اُن ہستیوں سے وابستہ کر لیتے ہیں جنھیں وہ اپنے زعم کے مطابق خدا کے حضور میں شفاعت کرنے والا سمجھتے ہیں۔

۲۳۴؎ 'زَفِیْر' اور 'شَهِیْق' کے جو الفاظ اصل میں آئے ہیں، دونوں گدھے کی چیخ کے لیے آتے ہیں۔ ایک

رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٠٧﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿١٠٨﴾ فَلَا تَكُ فِىْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ

(اُس عالم کے) زمین و آسمان قائم ہیں،[۲۳۵] اِلّا یہ کہ تیرا پروردگار کچھ اور چاہے۔ اِس میں شک نہیں کہ تیرا پروردگار جو چاہے، کر گزرنے والا ہے۔[۲۳۶] رہے وہ جو نیک بخت ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے۔ وہ اُسی میں رہیں گے، جب تک (اُس عالم کے) زمین و آسمان قائم ہیں، اِلّا یہ کہ تیرا پروردگار کچھ اور چاہے،[۲۳۷] ایسی عطا کے طور پر جو کبھی منقطع نہ ہو گی۔ سو، (اے پیغمبر)، تم اُن چیزوں کے معاملے میں کسی تردد میں نہ پڑو جنھیں یہ پوجتے ہیں۔[۲۳۸] یہ اُسی طرح پوج رہے ہیں، جس طرح اِن سے پہلے اِن کے باپ دادا

اُس چیخ کے لیے جو سانس کو باہر نکالتے وقت اور دوسرا اُس کے لیے جو سانس کو اندر کی طرف لے جاتے وقت پیدا ہوتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲۳۵؎ یعنی وہ عالم جو قیامِ قیامت کے وقت وجود میں آئے گا۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اُس دن ہمارے یہ زمین و آسمان ایک نئے زمین و آسمان میں تبدیل کر دیے جائیں گے۔ دوام اور ہمیشگی کے معنی میں یہ تعبیر ہماری زبان میں بھی اِسی طرح اختیار کی جاتی ہے۔

۲۳۶؎ قرآن کی یہی آیت ہے جس کی بنا پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک دن دوزخ کی بساط لپیٹ دی جائے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا عذاب وعدہ نہیں، بلکہ وعید ہے اور عالم کا پروردگار یہ حق یقیناً رکھتا ہے کہ اپنی رحمت سے مجرموں کی سزا میں تخفیف کرے یا خاک اور راکھ بنا کر اُنھیں ہمیشہ کے لیے اِسی دوزخ کی مٹی میں دفن کر دے۔ آیت کے آخر میں 'اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ' کے الفاظ اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

۲۳۷؎ یہ استثنا بتا رہا ہے کہ اہل جنت کے احوال و مراتب میں بھی تبدیلیاں ہوں گی، لیکن یہ خوب سے خوب تر کی نوعیت کی ہوں گی۔ چنانچہ آگے وضاحت کر دی ہے کہ خدا کی اِس بخشش میں کبھی انقطاع نہ ہو گا۔ پچھلی آیت کا خاتمہ 'اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ' کے الفاظ پر ہوا ہے۔ یہاں اُن کی جگہ 'عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ تبدیلی جنت اور دوزخ کے دوام میں اِسی فرق کی بنا پر کی گئی ہے۔

وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ
لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ
اَعْمَالَهُمْ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ

پوجتے رہے۔ ہمارا فیصلہ ہے کہ اِن کا حصہ ہم بغیر کسی کمی کے اِنھیں پورا پورا ادا کر دیں گے۔[239] ۱۰۰-۱۰۹
ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی تو اُس کے بارے میں بھی (اِسی طرح) اختلاف کیا گیا تھا۔[240] تیرے
پروردگار کی طرف سے اگر ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو اِن کے درمیان (اِس اختلاف
کا) فیصلہ چکا دیا جاتا۔[241] حقیقت یہ ہے کہ (جو کچھ تم پیش کر رہے ہو)، اُس کی طرف سے یہ لوگ ایسے
شک میں پڑے ہوئے ہیں جو الجھا دینے والا ہے۔ (تم مطمئن رہو)، تمھارا پروردگار اِن میں سے ہر
ایک کو اُس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا۔[242] یہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ اُس سے یقیناً باخبر ہے۔
سو تم بھی ثابت قدم رہو، جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے، اور وہ بھی جنھوں نے تمھارے ساتھ (اپنے پروردگار

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

---

۲۳۸ یعنی تمھیں یہ تردد نہ ہو کہ اچھے بھلے لوگ ہیں، آخر کسی دلیل کی بنیاد پر ہی اِن چیزوں کو پوجتے ہوں گے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ عتاب کا رخ اُنھی لوگوں کی طرف ہے جو یہ حماقت کر رہے تھے۔

۲۳۹ یعنی جس انجام کے مستحق ہیں، ٹھیک اُسی کو پہنچ جائیں گے۔ اِن میں سے کسی کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ ہر ایک کے لیے اُس کے اعمال کی پاداش میں جو صلہ مقرر کیا گیا ہے، وہ اُسے پورا مل جائے گا۔

۲۴۰ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمھاری قوم کے لوگ جو معاملہ قرآن کے ساتھ کر رہے ہیں، اِس سے پہلے یہی معاملہ تورات کے ساتھ ہو چکا ہے۔ چنانچہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ پریشانی کا باعث بن جائے۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت کے ساتھ اُن کی قوموں کا رویہ بالعموم یہی رہا ہے۔

۲۴۱ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اُس کی بنا پر کسی رعایت کے مستحق تو نہیں رہے، مگر اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اُس نے ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ لہٰذا انتظار کرو، اِن کا فیصلہ بھی اُسی وقت ہوگا، جب وہ مدت پوری ہو جائے گی۔

وَلَا تَطۡغَوۡا اِنَّہٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرۡکَنُوۡۤا اِلَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا فَتَمَسَّکُمُ
النَّارُ وَمَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ اَوۡلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ
طَرَفَیِ النَّہَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ذٰلِکَ ذِکۡرٰی
لِلذّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾

کی طرف) رجوع کیا ہے اور کجی اختیار نہ کرو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اُسے وہ دیکھ رہا ہے۔ (اِن کی ترغیب و ترہیب کے باوجود) اِن ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا، ورنہ تمھیں بھی آگ پکڑ لے گی اور خدا کے سوا تمھارا کوئی حامی نہ ہوگا، پھر کہیں سے مدد بھی نہیں پاؤ گے۔[۲۴۳] (اور دیکھو، اِس راہ میں ثابت قدمی کے لیے) دن کے دونوں حصوں میں نماز کا اہتمام کرو اور رات کے اوائل میں بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ایک یاددہانی ہے اُن کے لیے جو یاددہانی حاصل کرنے والے ہوں۔ اور صبر کرو، اِس لیے کہ اللہ اُن لوگوں کا اجر ضائع نہ کرے گا جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں۔[۲۴۴] ۱۱۰-۱۱۵

۲۴۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّ کُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّھُمۡ'۔ اِن میں 'ل' تاکید اور قسم کا ہے اور 'مَا' محض صوت و آہنگ کی ضرورت سے آ گیا ہے۔ اِس کی مثالیں قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی ہیں۔

۲۴۳؎ اِس لیے کہ معاملہ اُس پروردگار سے ہوگا جس کے مقابل میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔

۲۴۴؎ راہ حق کی مشکلات میں قرآن نے ہر جگہ دو ہی چیزوں کی تلقین کی ہے: ایک نماز اور دوسرے صبر و استقامت۔ یہاں یہ مضمون جس طریقے سے آیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کے بعض پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...نماز سے پہلے استقامت اور نماز کے بعد صبر کے ذکر میں ایک اشارہ اِس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ پامردی اور استقلال محمود اُسی صورت میں ہے، جب آدمی کا رخ صحیح سمت میں ہو۔ علاوہ ازیں ایک اور نکتہ بھی اِس آیت میں ہے۔ وہ یہ کہ یوں نہیں فرمایا کہ 'صبر کرو، اِس لیے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا'، بلکہ یوں فرمایا کہ 'صبر کرو، اِس لیے کہ اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا'۔ اِس سے اِس حقیقت کی طرف

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ
اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾
وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾
وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا

پھر (اِس پر بھی غور کرو کہ) ایسا کیوں نہ ہوا کہ تم سے پہلے کی امتوں میں[۲۴۵] ایسے اہل خیر ہوتے جو (لوگوں کو) زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت تھوڑے جنھیں ہم نے اُن میں سے نجات دی اور ظالم جس عیش میں تھے، اُسی میں پڑے رہے، (اِس لیے کہ) وہ مجرم تھے۔ (اے پیغمبر)، تیرا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو (اُن کے) کسی ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دے، جبکہ اُن کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں[۲۴۶]۔ ۱۱۶-۱۱۷

تیرا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی گروہ بنا دیتا، (مگر اُس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اُنھیں ارادہ و اختیار عطا فرمایا ہے تو اب یہی ہو گا کہ) وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے، سوائے اُن کے جن پر

اشارہ کرنا مقصود ہے کہ صبر بھی خدا کے ہاں عزیز و محبوب اور سزاوار اجر اُنھی لوگوں کا ہے جو اُس طرح صبر کریں، جس طرح صبر کرنے کا حق ہے۔ رو دھو کر اور گلے شکوے کر کے تو سب ہی صبر کر لیتے ہیں۔ خوب کاروں کا صبر یہ ہے کہ سروں پر آرے چل جائیں، لیکن نہ دل گلہ مند ہو نہ پیشانی پر بل آنے پائے۔ جو لوگ اِس شان و وقار سے صبر کرتے ہیں، اُن کا اجر کبھی ضائع نہیں جاتا۔'' (تدبر قرآن ۴/۱۷۶)

۲۴۵؎ یعنی اُن امتوں میں جن کی سرگذشتیں پیچھے بیان ہوئی ہیں۔

۲۴۶؎ یہ نہایت سبق آموز طریقے سے اُن کی تباہی کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد وہ اِس لیے ہلاک کر دیے گئے کہ اُن کی اکثریت آمادۂ فساد تھی اور اصلاح کرنے والے بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔ فرمایا کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ قوم میں اکثریت اصلاح کرنے والوں کی ہو اور وہ چند لوگوں کے کسی ظلم کی پاداش میں پوری قوم کو تباہ کر دے۔ اِس طرح کی تباہی اُسی وقت آتی ہے، جب قوم بحیثیت مجموعی فساد میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مَنۡ رَّحِمَ رَبُّکَ وَلِذٰلِکَ خَلَقَھُمۡ وَتَمَّتۡ کَلِمَۃُ رَبِّکَ لَاَمۡلَئَنَّ جَھَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۱۹﴾

وَکُلًّا نَّقُصُّ عَلَیۡکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِہٖ فُؤَادَکَ وَجَآءَکَ فِیۡ ھٰذِہِ الۡحَقُّ وَمَوۡعِظَۃٌ وَّ ذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلۡ لِّلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنَّا عٰمِلُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانۡتَظِرُوۡا اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰہِ غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاِلَیۡہِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّہٗ فَاعۡبُدۡہُ وَتَوَکَّلۡ عَلَیۡہِ وَمَا رَبُّکَ

تیرا پروردگار رحم فرمائے[۲۴۷]۔ اُس نے اِسی لیے اُن کو پیدا کیا ہے (کہ وہ اپنے اختیار سے فیصلہ کریں۔ یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ) تیرے پروردگار کی بات پوری ہوگئی (جو اُس نے کہی تھی) کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے اکٹھے بھر دوں گا[۲۴۸]۔ ۱۱۸-۱۱۹

اور، (اے پیغمبر)، رسولوں کی سرگذشتوں میں سے ہر ایک ہم تمھیں سنا رہے ہیں، جس سے ہم تمھارے دل کو مضبوط کریں۔ اِن کے اندر تمھارے پاس حق آیا ہے[۲۴۹] اور ماننے والوں کے لیے اِن میں نصیحت اور یاددہانی ہے۔ اُن سے کہہ دو، (اے پیغمبر)، جو نہیں مان رہے کہ تم اپنے طریقے پر کرو (جو چاہتے ہو)، ہم اپنے طریقے پر کریں گے۔ تم بھی انتظار کرو (کہ خدا کا فیصلہ کب صادر ہوتا ہے)، ہم بھی منتظر ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے، سب خدا کے پاس ہے اور تمام معاملات اُسی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں۔ سو، (اے پیغمبر)، اُسی کی بندگی کرو اور اُسی پر بھروسا

۲۴۷؎ یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق رحم فرمائے جو اُس نے لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور وہ بدی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کرلیں۔

۲۴۸؎ یہ اُس بات کا حوالہ ہے جو ابلیس کے جواب میں ارشاد ہوئی تھی، جب اُس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں ذریت آدم کو اِس طرح گھیروں گا کہ اُن کی اکثریت تیری شکرگزار نہیں رہے گی۔

۲۴۹؎ یعنی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ اہل حق کو غلبہ حاصل ہوا اور منکرین تباہ کر دیے گئے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

رکھو۔ تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو، تیرا پروردگار اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۱۲۰-۱۲۳

کوالالمپور

۳/ مارچ ۲۰۱۲ء

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امین احسن اصلاحی
ترتیب و تدوین: خالد مسعود-سعید احمد

خاص لوگوں کے گناہوں کے باعث عام عذاب نازل ہونے کے بارے میں روایات

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

(مَا جَاءَ فِی عَذَابِ الْعَامَّةِ بِعَمَلِ الْخَاصَّةِ)

وَحَدَّثَنِی مَالِكٌ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، أَنَهْلِكُ وَفِیْنَا الصَّالِحُوْنَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ.

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ، کیا ہم ہلاک کر دیے جائیں گے، دراں حالیکہ ہمارے درمیان نیک لوگ موجود ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، جب خباثت بڑھ جائے۔''

وضاحت

یہ روایت امام مالک کی بلاغات میں سے ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

سے صرف ایک ذریعہ سے معلوم ہے اور وہ بھی قوی نہیں[1]، لیکن میرے نزدیک اس کا مضمون قرآن کا مضمون ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک نے مضمون کو اہمیت دی ہے۔ خبث بڑھ جانے کا مطلب یہ ہے کہ نیک ہوں تو سہی، لیکن بہت اقلیت میں ہوں، شریروں کا غلبہ ہو۔ جب شریروں کا غلبہ ہو جائے تو قوم عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔ انبیا اور رسولوں کے زمانے میں تو یہ ہوتا ہے کہ صالحین چھٹ کر رسولوں کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ بچا لیے جاتے ہیں، لیکن اب یہ بات نہیں ہے، اس لیے اگر اشرار کی کثرت ہو جائے اور کوئی آفت آ جائے تو اس میں نیک بھی اشرار کی طرح پس جائیں گے، لیکن وہ اگر انکار منکر کا فرض ادا کرتے رہے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا اجر پائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ برائی کو برائی کہتے رہیں اور اپنی قوت سے اور زبان سے اس کو روکنے کی کوشش کریں۔ فرمایا کہ 'من رای منکم منکرًا فلیغیرہ بیدہ فإن لم یستطع فبلسانہ فإن لم یستطع فبقلبہ و ذالك أضعف الإیمان[2]'۔ ادنیٰ درجے کا ایمان یہ ہے کہ آپ ان کی برائی سے اپنے آپ کو بچائیں۔ قلب میں برا سمجھنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن آپ اگر شریروں کے قرب، ان کے تقرب، ان کے عطیات کو اپنے لیے شرف سمجھ کر قبول کریں گے تو وہ ادنیٰ ترین ایمان بھی نہیں ہو گا۔ ہاں آپ اگر اس حرکت سے بچ کر رہیں گے، اگرچہ آپ نے ادنیٰ درجۂ ایمان میں انکار منکر کا حق ادا نہیں کیا تب بھی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بچا لے گا، یعنی آخرت میں گرفت نہیں ہو گی۔ البتہ آج اگر دنیا میں کوئی آفت آئے گی تو یہ نہیں ہو گا کہ کچھ لوگ چھانٹ کر الگ کر لیے جائیں گے، بلکہ سب پس جائیں گے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَحَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنْ إِسْمَاعِیْلَ بْنِ أَبِیْ حَکِیْمٍ أَنَّهُ سَمِعَ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِیْزِ یَقُوْلُ: کَانَ یُقَالُ: إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی لَا یُعَذِّبُ الْعَامَّةَ بِذَنْبِ الْخَاصَّةِ وَلٰکِنْ إِذَا عُمِلَ الْمُنْکَرُ جِهَارًا اسْتَحَقُّوا الْعُقُوْبَةَ کُلُّهُمْ.

''اسمٰعیل بن ابی حکیم سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو یہ کہتے سنا کہ کہا جاتا

1. التمہید، ابن عبد البر ۲۴/ ۳۰۴، رقم ۱۸۷۔

2. مسلم، رقم ۴۹۔ ''تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اسے ختم کرے، اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھے تو اپنی زبان سے، اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھے تو اپنے دل سے، اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔''

تھا کہ اللہ تعالیٰ کچھ تھوڑے سے لوگوں کے گناہوں کے بدلے میں عام لوگوں کو عذاب نہیں دے گا۔ لیکن اگر منکر پر کھلم کھلا عمل کیا جائے تو سب کے سب عذاب کے مستحق ہوں گے۔''

وضاحت

اس روایت میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو اور اس کے نکیر کی کوئی آواز بلند نہ ہو تو جن لوگوں کے اندر ادنیٰ درجہ کا ایمان ہوگا، ان کے لیے آخرت میں بچنے کی تو امید ہے، لیکن اس دنیا میں عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔ قوموں کے بارے میں یہی سنت الٰہی ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔

(تدبر حدیث ۵۱۸-۵۱۹)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معز امجد
ترجمہ وتدوین: شاہد رضا

حکمران، ائمۂ مساجد اور صحابۂ کرام

رُوِیَ أَنَّہُ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: یَا مَعَاذُ، أَطِعْ کُلَّ أَمِیْرٍ وَصَلِّ خَلْفَ کُلِّ إِمَامٍ وَلَا تَسُبَّنَّ أَحَدًا مِّنْ أَصْحَابِیْ.

روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے معاذ، ہر حکمران کی اطاعت کرو، ہر امام کے پیچھے نماز ادا کرو اور میرے صحابہ میں سے کسی کی بھی توہین نہ کرو۔

وضاحت

یہ روایت سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۱۶۵۴۶ میں روایت کی گئی ہے۔ اس روایت کے آخر میں امام بیہقی نے بذات خود اس کی استنادی حیثیت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وھذا منقطع بین مکحول و معاذ. ''اس کی سند مکحول اور معاذ کے درمیان منقطع ہے۔''

خلاصۂ بحث

چونکہ یہ روایت ایسی سند کے ذریعے سے روایت کی گئی ہے جو منقطع ہے، اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ واقعتاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خالد مسعود

امام فراہی کا تصور حکمت

'حکمت' کا لفظ دانائی کی باتوں کے لیے ایک معروف لفظ ہے اور نہایت کثیر الاستعمال ہے، لیکن مختلف علوم کے ماہرین اور اہل لغت اس کی تعبیر اتنے مختلف طریقوں سے کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک عام لفظ کے اندر کتنا جہان معانی آباد ہے۔ اہل فلسفہ اور صوفیا اپنی کاوشوں کو حکمت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اہل لغت اس کا مفہوم کچھ اور بیان کرتے ہیں، اہل تاویل کے مابین قرآن کے اندر لفظ 'حکمت' کے معانی کے تعین میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں یوں تو لفظ 'حکمت' متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کے بیان میں تعلیم حکمت کی تکرار اس قدر نمایاں ہے کہ آدمی اس کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید کے ایک طالب علم کے لیے حکمت کے مفہوم کو سمجھنا از بس ضروری ہے۔

امام حمید الدین فراہی کا موضوع فکر قرآن حکیم تھا، اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر تھی اور کسی بھی اہم لفظ یا مضمون پر سے وہ بلا تحقیق گزر جانے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے لفظ 'حکمت' کی اہمیت کے پیش نظر اس کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس کی لغوی تحقیق ان کی کتاب ''مفردات القرآن'' میں ہے، جبکہ قرآن مجید میں اس لفظ کے استعمال پر انھوں نے اپنی ایک مستقل تصنیف ''حکمت القرآن'' میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ کے نتائج تحقیق نہایت وقیع، فکر آفریں اور قرآنی مباحث کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

لفظ 'حکمت' کے معنی

لفظ 'حکمت'، مادہ 'ح ک م' سے مشتق ہے۔ اسی مادہ سے دوسرا اسم 'حکم' ہے۔ ''لسان العرب'' میں حکم کے معنی

'العلم و الفقه و القضاء بالعدل'[1]، یعنی علم، سوجھ بوجھ اور عدل کے مطابق فیصلہ کے آئے ہیں۔ ''تاج العروس'' میں اس کے معنی ہیں: 'القضاء فی الشئ'[2]، یعنی کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا۔ اس میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک اس لفظ کا اطلاق صرف اس فیصلہ پر ہوتا ہے جو عدل کے ساتھ طے کیا جائے۔ امام فراہی کے نزدیک الفاظ کے لغوی معانی کے تعین کے لیے مرجع کی بہترین کتاب خود قرآن مجید ہے۔ اس کے استعمالات کی روشنی میں انھوں نے لفظ 'حکم' کا اطلاق محض فیصلہ کرنے پر کیا ہے، خواہ یہ فیصلہ حق ہو یا باطل۔ اس معنی کے لیے ان کی رہنمائی جن آیات سے ہوئی وہ یہ ہیں:

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ. (القلم ۶۸: ۳۶) ''تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو!''

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ. (المائدہ ۵: ۵۰) ''کیا وہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں۔''

اول الذکر آیت مشرکین کی اس غلط رائے پر تعجب کا اظہار کرتی ہے جو وہ آخرت کے بارے میں ظاہر کرتے تھے۔ مؤخر الذکر آیت میں جاہلیت پر مبنی فیصلہ پر لفظ 'حکم' کا اطلاق کیا ہے۔ یہ فیصلہ، ظاہر ہے، حق کے مطابق نہ تھا۔ امام فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک لفظ کا اصل مفہوم یہی تھا، لیکن پھر اس کا اطلاق اس قوت پر بھی ہونے لگا جس کی بدولت آدمی صحیح فیصلے کرتا ہے۔

لفظ 'حکمت' بھی مادہ 'ح ک م' سے اسم ہے۔ جس کے معانی ''لسان العرب'' میں 'معرفة أفضل الأشياء بأفضل العلوم'[3] کے آئے ہیں، یعنی اعلیٰ چیزوں کی پہچان بہترین علوم کے ذریعہ سے حاصل کرنا۔ دوسرے معنی عدل کے بتائے گئے ہیں۔ ''تاج العروس'' میں اس سے مراد 'العلم بحقائق الأشياء على ما هي عليه و العمل بمقتضاها'[4]، یعنی اشیا کی حقیقت کو ان کی اصلیت کے مطابق جاننا اور اس علم کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا ہے۔ حق کو علم و عمل، دونوں کے لحاظ سے درست قرار دینا اور عدل سے فیصلہ کرنا بھی حکمت قرار دیا گیا ہے۔ جرجانی کے نزدیک ہر وہ بات جو حق کے موافق ہو حکمت کہلاتی ہے[5] اور اس لفظ کا اطلاق اس علم پر بھی ہوتا ہے جس کے ساتھ عمل پایا جائے۔ راغب اصفہانی رحمہ اللہ علم اور عقل سے حق کی مطابقت کو حکمت قرار دیتے ہیں[6]۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اس کی تعبیر قول و عمل

۱؎ ۱۲/۱۴۱۔

۲؎ ۳۱/۵۱۰۔

۳؎ ۱۲/۱۴۰۔

۴؎ ۳۱/۵۱۲۔

۵؎ کتاب التعریفات ۱/۱۲۴۔

۶؎ المفردات فی غریب القرآن ۱/۱۲۷۔

کی درستی اور ہر شے کو اس کا مقام دینے سے کی ہے[7]۔ امام فراہی رحمہ اللہ نے لفظ کے معانی کا تعین اولاً اہل عرب کے استعمالات کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اہل عرب حکمت کا اطلاق اس قوت پر کرتے تھے جو عقل و رائے کی درستی اور اس سے پیدا ہونے والی اخلاقی شرافت کی جامع ہو۔ اسی لیے وہ ایک دانش منداور مہذب آدمی کو حکیم کہتے تھے۔ لہٰذا امام فراہی رحمہ اللہ نے حکمت کی تعبیر اس قوت سے کی ہے جس کے باعث آدمی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس قوت کے اثرات کلام کی حقانیت، اخلاق کی پاکیزگی اور حسن ادب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ثانیاً، امام فراہی رحمہ اللہ کے پیش نظر قرآن مجید کی وہ آیات بھی ہیں جن میں حکمت کے معانی کا تعین کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا:

وَاٰتَیۡنٰهُ الۡحِکۡمَةَ وَفَصۡلَ الۡخِطَابِ.

''اور ہم نے اس کو حکمت اور معاملات کے فیصلہ کی صلاحیت عطا کی۔'' (صٓ ۳۸: ۲۰)

امام فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک الفاظ 'فَصۡلَ الۡخِطَابِ' میں حکمت کا ایک اثر یہ بیان ہوا ہے کہ جہاں حکمت موجود ہوتی ہے وہاں حق پر مبنی دوٹوک بات کہی جاتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں بعض اخلاقی ہدایات دینے کے بعد فرمایا گیا ہے:

ذٰلِکَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَةِ.

''یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمھارے رب نے حکمت میں سے تمھاری طرف وحی کی ہیں۔'' (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۹)

اس سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ کردار بھی حکمت ہی کا ایک پرتو ہے۔ ان آیات کی روشنی میں امام فراہی رحمہ اللہ کی بتائی ہوئی حکمت کی تعریف کی تائید ہوتی ہے۔

حکمت کی خصوصیات

مولانا نے حکمت کی بعض خصوصیات بیان کر کے اس کے تصور کو قریب الفہم بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حکمت کی بات عقل و دل کے نزدیک نہایت بدیہی اور واضح ہوتی ہے۔ یہ اس قدر دل میں اتر جانے والی ہوتی ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے مزید دلائل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ حکمت ایک نور ہے۔ جس طرح روشنی سے اردگرد کی تمام چیزیں جگمگا اٹھتی ہیں، اسی طرح حکمت کے نور سے آدمی کا علم منور ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح آگ کا اثر حرارت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ہر شخص اس کو محسوس کر لیتا ہے، اسی طرح حکمت بھی اپنے اثرات سے پہچانی جاتی

[7] التفسیر الکبیر ۲/ ۱۸۹۔

ہے۔ جب یہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر حق شناسی کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی ہے حق نکلتی ہے اور اس سے جو فعل صادر ہوتا ہے، ٹھیک صادر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک حکیم آدمی کا دل اپنے اندر رفعت محسوس کرتا ہے، اس کا کلام نہایت دل نشین ہوتا ہے، اس کا عمل نیکی پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ اخلاق کا مجسمہ ہوتا ہے۔

لوگوں میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اہل فلسفہ حکمت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کو حکیم کہا بھی جاتا ہے، لیکن امام فراہی رحمہ اللہ اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک فلسفیوں نے علم اور عالم کو موضوع فکر تو ضرور بنایا، لیکن بالعموم ان کے فکر کی کوئی مضبوط اساس نہ تھی۔ وہ اوہام کا شکار رہے اور علم کے اصل سرچشموں تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ ارسطو تمام علوم کا احاطہ کر لینے کو حکمت کا نام دیتا تھا، حالاں کہ علوم کا احاطہ کسی بھی انسان کے بس میں نہیں۔ اس مخمصہ سے نکلنے کے لیے اس نے علم کو کلیات کے علم تک محدود کرنے کی کوشش کی اور مابعدالطبیعیات کے علم کو اعلیٰ حکمت قرار دیا، لیکن اس کے باوجود وہ ابتدائی وہم سے نہ نکل سکا۔ امام فراہی رحمہ اللہ عام علوم کو حکمت کا موضوع سمجھتے ہی نہیں، اس لیے مسلمان فلسفیوں ـــــ اخوان الصفا، ابن سینا، الفارابی، الخوارزمی، الغزالی اور ابن خلدون ـــــ کی علوم کی وہ تقسیم جس میں پایدار علوم کو حکمت کا نام دیتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔

امام فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک حکیم کے اندر حق کی جستجو کا مادہ اور جانچ پرکھ کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ باطل میں سے حق کو چھانٹ لیتا ہے۔ حق میں جو نورانیت ہوتی ہے، اس کو حکیم کی فطرت کی بصیرت فوراً محسوس کر لیتی ہے۔ چونکہ اس کائنات کا سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر بندے کا ایمان لانا ہے، اس لیے مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک حکیم کی پہلی شناخت اس کا ایمان ہے۔ وہ اس حق کو پہچانے، اس پر اس کا دل مطمئن ہو جائے، وہ ہر باطل سے دست کش ہو جائے اور عمل صالح کو اختیار کر لے تو وہ، بلاشبہ ایک حکیم ہے۔ اگر وہ ایمان تک نہ پہنچ سکا تو دوسرے علوم وفنون میں اس کی مہارت کی بدولت اس کو حکیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سلف میں حکمت کے مفہوم پر اختلاف کی وجہ

سلف صالحین کے دور میں حکمت کے قرآنی مفہوم کے تعین میں اختلاف واقع ہوا ہے جس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں ملتی ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ کے پیش نظر یہ اختلاف تھا اور انھوں نے اس کو رفع کرنے کی نہایت عمدہ کوشش کی ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ امام مالک اور ابورزین کی رائے میں حکمت سے مراد دین کی سوجھ بوجھ اور ایسا

فہم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہوتا ہے۔ مجاہد نے اس کو قرآن کے فہم کے لیے مخصوص کیا ہے۔ یحییٰ بن معاذ کی رائے میں حکمت اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جس کو وہ عارفین کے دلوں کی طرف بھیجتا ہے تاکہ ان پر دنیا کے مضر اثرات کا ازالہ کرے۔ ابن زید کے نزدیک ہر وہ بات حکمت کی بات ہے جو آدمی کو تنبیہ کرے، اس کو کسی نیکی کی طرف بلائے یا کسی برے کام سے روکے۔ ابو جعفر محمد بن یعقوب ہر اس بات کو حکمت قرار دیتے ہیں جس سے صحیح فعل پیدا ہو۔ مقاتل کی رائے میں علم اور اس کے مطابق عمل کا نام حکمت ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ نے ان تمام اقوال کا حوالہ دے کر ان کو ایک ہی حقیقت کی مختلف انداز سے ترجمانی قرار دیا ہے[8]۔ ان کے نزدیک حکمت سب سے پہلے انسان کے دل میں بطور بصیرت و توفیق ظاہر ہوتی ہے۔ دل منور ہوتا ہے تو اس کا اثر کلام پر پڑتا ہے، چنانچہ حکمت کا اظہار انسان کے کلام سے ہونے لگتا ہے۔ وہ حق بات کہتا، نیکی کی تعلیم دیتا اور بدی سے روکتا ہے۔ اس کے بعد حکمت انسان کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ اخلاق فاضلہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح اس کے علم اور عمل میں کامل مطابقت ہو جاتی ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ کی اس تقریر کی روشنی میں مالک، ابو رزین، مجاہد اور یحییٰ بن معاذ نے کلام میں اس کے اثر کو نمایاں کیا ہے اور مقاتل نے علم و عمل، دونوں میں حکمت کے اثرات کا حوالہ دیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رسول اللہ کے فرائض میں تعلیم حکمت

قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کے ضمن میں تعلیم کتاب و حکمت کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ اس کی تفسیر میں تعلیم کتاب کے لیے بالعموم مفسرین کا ذہن قرآن مجید کی طرف گیا ہے، لیکن تعلیم حکمت کے لیے وہ کسی بات پر اتفاق نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ، جن میں امام شافعی رحمہ اللہ سر فہرست ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہاں حکمت سے مراد سنت رسول اللہ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب 'کتاب' اور 'حکمت' کے الفاظ ساتھ ساتھ آ رہے ہیں تو لازم ہے کہ ان سے دو مختلف چیزیں مراد لی جائیں۔ چونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت اور آپ کے احکام کا اتباع فرض ہے، اس لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی ایسی چیز ہو سکتی ہے جس کا ذکر کتاب اللہ کے ساتھ کیا جائے، لہٰذا 'حکمت' سے مراد سنت رسول ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ نے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے اور اس کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی دو آیات ایسی پیش کی ہیں جن میں 'کتاب' اور 'حکمت' کے الفاظ ایک ساتھ آئے ہیں، لیکن وہاں 'حکمت' سے مراد سنت کو ہرگز نہیں لیا جا سکتا۔ وہ آیات یوں ہیں:

8۔ حکمت قرآن (اردو)، فراہی ۲۹، بہ حوالہ البحر المحیط، ابو حیان الاندلسی ۱/ ۳۹۳۔

وَاَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ. (النساء۴:۱۱۳)	''اور اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل فرمائی اور تمھیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے۔''
وَاذۡكُرۡنَ مَا يُتۡلٰى فِىۡ بُيُوۡتِكُنَّ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالۡحِكۡمَةِ. (الاحزاب۳۳:۳۴)	''اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے، اس کا چرچا کرو۔''

ان آیات میں حکمت کے لیے فعل 'اَنۡزَلَ' اور 'يُتۡلٰى' استعمال ہوئے ہیں جو قرآن میں صرف وحی آسمانی کے لیے آئے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی اور اسی کی تلاوت آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے گھروں میں ہوا کرتی تھی۔ یہ دونوں فعل کہیں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و افعال کے لیے استعمال نہیں ہوئے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ کا مزید استدلال یہ ہے کہ حدیث رسول، دانش و موعظت کے مضامین کے لیے خاص نہیں، بلکہ احکام شریعت کی حامل بھی ہو سکتی ہے۔ اگر اس کا تعلق قانون سے ہو تو اس صورت میں اس پر 'حکمت' کے لفظ کا اطلاق بالکل نامناسب ہو گا۔ مزید برآں قرآن مجید نے اپنی تعلیم کے اندر پائے جانے والے اصول دین کو سورۂ بنی اسرائیل آیت ۳۹ میں خود حکمت سے موسوم کیا ہے۔ لہٰذا یہ ہرگز ضروری نہیں کہ 'حکمت' سے مراد قرآن سے باہر کی کوئی چیز سمجھی جائے۔ مولانا کے نزدیک 'کتاب' سے قرآن مجید کے ایک ضابطۂ شریعت ہونے کا مفہوم نکلتا ہے اور حکمت یہ اس اعتبار سے ہے کہ اس میں شریعت کی حکمت، صحیح عقائد اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس مضمون کی دلیل سورۂ آل عمران میں ہے۔ فرمایا:

وَيُعَلِّمُهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَالتَّوۡرٰةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ. (۳:۴۸)	''اور اللہ اس کو کتاب اور حکمت، تورات اور انجیل سکھائے گا۔''

اس آیت میں 'کتاب' اور 'حکمت' کی تفسیر تورات اور انجیل سے کی گئی ہے۔ تورات ایک ضابطۂ شریعت تھی جس کی تعلیم ایک ایسی قوم کے لیے مناسب تھی جو ابھی عالم طفولیت میں تھی، اس کی ذہنی و قلبی استعداد اس سے زیادہ کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو ان کو انجیل عطا کی گئی جس کے متعلق خود انھوں نے یہ وضاحت کر دی کہ یہ صحیفۂ حکمت ہے:

وَلَمَّا جَآءَ عِيۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ قَالَ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِالۡحِكۡمَةِ. (الزخرف۴۳:۶۳)	''اور جب عیسیٰ کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو اس نے دعوت دی کہ میں تمھارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تعلیم حکمت کے لیے تمثیلات کے اسلوب کا سہارا لیا۔ تاہم انجیل کی تعلیم بھی ادھوری تھی، کیونکہ بنی اسرائیل کی ذہنی استعداد ابھی تک کامل حکمت کے تحمل کے لائق نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

نے اپنی قوم کو یہ واضح پیغام دیا کہ مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں، لیکن تم ان سب کا تحمل نہ کر سکو گے۔ لہٰذا اب میں جاتا ہوں اور میرے بعد جو آئے گا، وہ تمھیں ان باتوں کی تعلیم بھی دے گا جن کی تعلیم میں تمھیں نہ دے سکا۔ یہ بعد میں آنے والے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے اور آپ کے پاس وہ صحیفۂ ہدایت تھا جو ضابطۂ شریعت اور حکمت دین، دونوں کا جامع ہے۔ اس میں ایک طرف حرام وحلال کی تمام حدود نہایت واضح اور متعین ہیں، تو دوسری طرف یہ ایک عمیق فلسفہ اور گہری حکمت بھی رکھتا ہے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک کتاب وحکمت کے الفاظ استعمال کرنے سے قرآن مجید کی اسی حیثیت کو واضح کرنا مقصود ہے۔

اس استدلال کی روشنی میں امام فراہی رحمہ اللہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی راے خطا پر مبنی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حدیث رسول نہ صرف حکمت کی حامل ہوتی ہے، بلکہ قرآن کی حکمت کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ جہاں اسلاف میں سے کسی کو تنقید کا نشانہ بنائیں تو ان کا رجحان طبع یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے حسن ظن کو مجروح نہ ہونے دیں۔ چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ کی راے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام صاحب کے زمانہ میں لوگ قرآن کی تاویل غلط عقلیات کی روشنی میں کرنے لگ گئے تھے جس سے آیات کا مفہوم کہاں سے کہاں جا نکلتا تھا۔ امام صاحب نے ایسے لوگوں پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ فہم کتاب، سنت رسول کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ سنت ہی کتاب اللہ کی تبیین کرتی ہے، ورنہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی کتاب ''الرسالہ'' میں جہاں یہ بحث لکھی ہے، مقدمۂ کتاب میں علم کو قرآن مجید کے علم پر منحصر مانا اور بتایا ہے کہ دل اگر منور ہوتا ہے تو حکمت کے نور سے منور ہوتا ہے اور یہ حکمت کتاب اللہ کے علم اور اس کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تحصیل حکمت کی تدابیر

مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک انسان کی دو بنیادی صفات اس کی قوت فکر اور قوت ارادہ ہیں۔ قوت فکر کے ذریعے وہ ان نشانیوں سے استدلال کر سکتا ہے جن سے آفاق وانفس بھرے پڑے ہیں اور قوت ارادہ کی بدولت وہ خیر وسعادت کے کاموں کو اختیار کرتا ہے۔ حکمت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو غور وفکر کے ذریعے سے حاصل ہونے والے علم اور ارادہ کی قوتوں میں موافقت پیدا کر لے۔ حکمت کا منبع انسان کے خارج میں نہیں ہوتا، بلکہ اس کی ذات کے اندر اور اس کی فطرت میں ہوتا ہے، اس لیے حکمت کے طالب کو اپنے نفس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے۔ حکمت کا تحمل یک بارگی نہیں ہوتا، بلکہ بتدریج ہوتا ہے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے، جس طرح ایک نقشہ

کے مطابق کسی عمارت کی تعمیر درجہ بدرجہ مکمل ہوتی ہے۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ دل کے خشوع کو وہ دروازہ قرار دیتے ہیں جس کے راستے حکمت دل میں داخل ہو کر اس کو زندگی بخشتی ہے۔ خشوع رکھنے والے شخص کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے، اس کو پیدا کرنے والا عادل اور پاکیزہ رب ہے، جبکہ انسان غلطی کا ارتکاب کرنے والا، بھٹک جانے والا اور سرکشی اختیار کرنے والا ہے۔ اس احساس سے آدمی میں خشیت پیدا ہوتی ہے، وہ خلوت وجلوت میں حدود الٰہی کی پابندی اختیار کرتا اور خواہشات نفس کی پیروی سے باز رہتا ہے۔ ان صفات سے اس کا قلب صاف اور حکمت کے نور سے مستنیر ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔

حصول حکمت کے لیے جو چیزیں نہایت اہم ہیں، وہ ذکر الٰہی، تلاوت قرآن، اللہ کے بندوں پر شفقت اور ان کے لیے جذبۂ ترحم ہیں۔ قرآن حکیم حکمت کا سب سے بڑا خزانہ ہے، لیکن اس کے اندر حکمت کے موتی تلاش کرنے کے لیے غور و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ حصول حکمت کی تگ و دو کے لیے انسان جو ذرائع بھی اختیار کرے، لیکن مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کے حصول میں کامیابی اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔ حکمت اللہ تعالیٰ کی وہ عطاے خاص ہے جس کے سیکھنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

(حکمت قرآن ۱۳-۲۵)

www.javedahmadghamidi.com
www.almawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت عامر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

حضرت عامر بن ابی وقاص مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص کے چھوٹے اور سگے بھائی تھے۔ بنوزہرہ بن کلاب سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے زہری کہلاتے تھے۔ ان کے والد کا نام مالک بن وہیب (یا اہیب) تھا، لیکن وہ اپنی کنیت ابووقاص سے مشہور تھے۔ عبدمناف عمیر کے پڑدادا تھے۔ حضرت عمیر کے دادا وہیب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نانا وہب کے بھائی تھے، آپ کی والدہ کا نام آمنہ بنت وہب بن عبدمناف تھا، اس لحاظ سے حضرت عامر بن ابی وقاص اور ان کے بھائی حضرت عمیر اور حضرت سعد آپ کے ماموں ہوئے۔ پانچویں جد کلاب بن مرہ پر حضرت عمیر کا شجرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب سے مل جاتا ہے۔ حضرت عمیر کی والدہ کا نام حمنہ بنت سفیان تھا، پانچویں پشت قصی پر ان کی والدہ کا شجرۂ نسب بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرہ سے جا ملتا ہے۔ ابوعمرو عامر کی کنیت تھی۔

حضرت عامر بن ابی وقاص 'السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'* میں شامل تھے، ابن سعد کے مطابق مخلصین کی اس فہرست میں ان کا نمبر گیارہواں ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ بچوں کو اپنی ماں کی طرف سے، کوئی بھی حالات ہوں، لاڈ ہی ملتا ہے، لیکن حضرت عامر کی والدہ دین جاہلیت میں اتنا رسوخ رکھتی تھی کہ شفقت مادری کو بھی پس پشت ڈال دیا۔ اس نے اپنے بیٹوں کے ایمان لانے پر بہت غوغا کیا۔ اس صورت حال کا ایک منظر ان کے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص یوں بیان کرتے ہیں: میں تیراندازی کر کے گھر لوٹا تو دیکھا کہ میری والدہ حمنہ اور حضرت عامر کے گرد لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے۔ پوچھا: کیا معاملہ ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ حضرت عامر کے اسلام قبول کرنے پر تمھاری والدہ نے اللہ کی قسم

---

* التوبہ ۹: ۱۰۰۔

کھالی ہے کہ اس وقت تک کسی سائے یا چھت تلے بیٹھیں گی نہ کھائیں پئیں گی جب تک یہ نیا دین نہیں چھوڑتا۔ حضرت سعد لوگوں کا مجمع چیر کر والدہ کے پاس پہنچے اور کہا: امی، یہ قسم میرے لیے بھی کھا لیجیے، پوچھا: کیوں؟ جواب دیا: یہ کہ تو سایے میں بیٹھے گی، کھانا کھائے گی نہ پانی پیے گی، حتیٰ کہ جہنم میں اپنا ٹھکانا دیکھ لے، وہ بولی: میں اپنے بیٹے کے خلاف کھائی ہوئی قسم پوری کروں گی۔ تین روز گزرنے کے بعد حمنہ بے ہوش ہوئی تو اس کے دوسرے بیٹے عمارہ نے پانی پلا کر بھوک ہڑتال ختم کی۔ والدین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا اول اطلاق سعد و عامر ہی پر ہوا:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا. (لقمٰن ۳۱: ۱۵)

”اور اگر یہ دونوں (ماں باپ) تیرے درپے ہوں کہ تم میرے ساتھ ایسا شریک ٹھہراؤ جس (کے خدائی میں شریک ہونے) کی تمھارے پاس کوئی علمی (و یقینی) اطلاع نہیں تو ان کی اطاعت نہ کرنا۔“

(مسلم، رقم ۶۳۱۷۔ احمد، رقم ۱۶۱۴)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رجب ۵/ نبوی میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی ایذا رسانیوں سے ستائے ہوئے صحابہ کو مشورہ دیا کہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں، کیونکہ وہاں ایسا بادشاہ حکمران ہے جس کی سلطنت میں ظلم نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ سب سے پہلے پندرہ صحابہ پر مشتمل جماعت حبشہ کی طرف روانہ ہوئی۔ حضرت عثمان بن عفان، حضرت زبیر بن عوام اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اس میں شامل تھے۔ چند ماہ کے بعد حضرت جعفر بن ابوطالب کی قیادت میں دو کشتیوں پر سوار اہل ایمان کا دوسرا قافلہ روانہ ہوا۔ حضرت عبداللہ بن جحش، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت مقداد بن اسود اور دوسرے صحابہ کے ساتھ حضرت عامر بن ابی وقاص بھی اس قافلے میں موجود تھے۔ حضرت عامر کو اپنے ہی گھر والوں کی طرف سے اذیتیں پہنچائی گئیں، اس لیے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ ابن اسحاق کی گنتی کے مطابق دونوں گروپوں کے مہاجرین کی مجموعی تعداد تراسی تھی۔ طبری نے بیاسی کا عدد بتایا ہے، جبکہ ابن جوزی کا شمار ایک سو آٹھ ہے۔ ابن اسحاق نے مہاجرین حبشہ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

ہجرت اولیٰ: گیارہ مرد اور چار خواتین۔

ہجرت ثانیہ: تراسی مرد اور اٹھارہ عورتیں جن میں سے گیارہ قریش کی اور سات دوسرے قبائل کی تھیں۔

حضرت عامر بن ابی وقاص حبشہ میں تھے، اس لیے بدر، احد اور خندق کے غزوات میں شریک نہ ہو سکے۔ حضرت ابن سعد کا یہ کہنا کہ حضرت عامر جنگ احد میں شریک ہوئے، درست معلوم نہیں ہوتا۔

ہجرت مدینہ کو سات برس بیت گئے تو حضرت جعفراور باقی مہاجرین نے یہ کہہ کر مدینہ جانے کی خواہش ظاہر کی کہ ہمارے نبی غالب آ گئے ہیں اور دشمن مارے جا چکے ہیں، تو نجاشی نے زادراہ اور سواریاں دے کر ان کو رخصت کر دیا (المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۴۷۸)۔ عمرو بن امیہ ضمری، جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نجاشی کے نام خط دے کر حبشہ کی طرف بھیجا تھا، مہاجرین کو دو کشتیوں میں سوار کر کے لائے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری روایت کرتے ہیں کہ ہم یمن میں تھے جب ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی اطلاع ملی۔ میں اور میرے دو بھائی آپ کی طرف ہجرت کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ ایک بھائی کا نام ابو بردہ (عامر بن قیس) اور دوسرے کا ابورہم (مجدِی یا محمد بن قیس) تھا (حدیث کے راوی کو شک ہے کہ حضرت ابوموسیٰ نے (ان تین باتوں میں سے) کون سی کہی)۔ ہمارے ساتھ ہماری قوم کے چند آدمی اور تھے یا ان کی تعداد باون یا ترپن تھی۔ ہم سب (یمن سے) ایک کشتی پر سوار ہوئے، (اتفاق سے ہوا کا رخ بدلا تو) ہماری کشتی نے ہمیں ملک حبشہ میں نجاشی کے پاس پہنچا دیا۔ وہاں ہماری ملاقات حضرت جعفر بن ابوطالب اور ان کے ساتھیوں سے ہوئی۔ حضرت جعفر نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہاں بھیجا ہے اور یہیں قیام کرنے کا حکم دیا ہے، تم بھی ہمارے ساتھ رہو۔ ہم ان کے ساتھ ہی رہے، پھر سب مل کر (مدینہ) آئے۔ ہماری ملاقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت ہوئی جب آپ خیبر فتح کر چکے تھے۔ آپ نے مال غنیمت میں سے ہمارا بھی حصہ نکالا۔ حضرت جعفر اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ جو کشتی (دو کشتیوں) میں لوٹے تھے، آپ نے فتح خیبر میں شمولیت نہ کرنے والے کسی شخص کو حصہ نہ دیا (بخاری، رقم ۳۱۳۶)۔

ابن مندہ کی ایک روایت کے مطابق، حضرت ابوموسیٰ کا قافلہ پہلے مکہ گیا، پھر بحری راستے سے مدینہ گیا۔ اس طرح کشتی کے حبشہ جا پہنچنے کا واقعہ ان کے مکہ میں داخل ہونے اور کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد پیش آیا۔

ابن اسحاق نے شرکاے قافلہ کی تفصیل بیان کی ہے۔ ۷ھ میں مدینہ پہنچنے والے اس قافلہ میں حضرت جعفر بن ابوطالب اور حضرت عامر بن ابی وقاص کے علاوہ یہ اہل ایمان شریک تھے: حضرت جعفر کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس، حضرت عبداللہ بن جعفر، حضرت خالد بن سعید بن عاص، ان کی اہلیہ حضرت امینہ (یا ہمینہ) بنت خلف، حضرت سعید بن خالد، حضرت امہ بنت خالد، حضرت عمرو بن سعید، حضرت معیقیب بن ابو فاطمہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت اسود بن نوفل، حضرت جہم بن قیس، حضرت عمرو بن جہم، حضرت خزیمہ بنت جہم، حضرت عتبہ بن مسعود، حضرت حارث بن خالد، حضرت عثمان بن ربیعہ، حضرت محمیہ بن جزء، حضرت معمر بن عبداللہ، حضرت ابوحاطب بن عمرو، حضرت مالک بن ربیعہ، ان کی زوجہ حضرت عمرہ بنت سعدی اور حضرت حارث بن عبد قیس رضی اللہ عنہم۔ ان

کے علاوہ حبشہ میں وفات پانے والے اصحاب کی بیوگان بھی شریک سفر تھیں۔ ساحل سمندر سے انھوں نے اونٹ حاصل کیے اور ان کے ذریعے سے مدینہ پہنچے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ خیبر میں فتح یاب ہو کر لوٹے تھے۔ آپ کو حضرت جعفر اور دوسرے اصحاب کے مدینہ پہنچنے کی بہت خوشی ہوئی۔

ابن ہشام نے 'السیرۃ النبویۃ' میں ابن اسحاق کی یہ فہرست نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ دو کشتیوں میں سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے والے کل مرد سولہ تھے۔ دیکھا جائے تو محض اس فہرست کا شمار انیس مرد اور پانچ عورتیں ہے، بیوگان ان کے علاوہ تھیں جن کی تعداد بتائے بغیر ابن اسحاق نے مجمل ذکر کر دیا ہے۔ اس طور یہ بیان کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ سولہ افراد کے بجائے سولہ کنبے تھے۔ اصل میں ابن ہشام نے مدینہ میں آنے والوں کو قبیلہ وار تقسیم کیا ہے، انھوں نے کل گیارہ قبائل کا ذکر کیا ہے، پھر بنو عبد شمس کے چار (أربعة نفر)، بنو زہرہ کے دو (رجلان) اور بنو عامر کے دو افراد (رجلان) بتائے ہیں، کیونکہ یہ لوگ ایک فیملی سے نہ تھے۔ بقیہ شرکاے قافلہ باپ بیٹا یا میاں بیوی تھے، اس لیے انھیں ایک اکائی (رجل) کے طور پر لکھ دیا۔ یوں سولہ کا مجموعہ حاصل ہوتا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ ابن اسحاق نے ابوموسیٰ کے دونوں بھائیوں اور بقیہ اشعری ساتھیوں کا نام نہیں لیا۔ لگتا ہے کہ بخاری کی روایت ان کے علم میں نہیں رہی۔ شارح ''السیرۃ النبویۃ'' سہیلی نے قافلہ کی فہرست میں ان تین اصحاب کا اضافہ کیا ہے: ہشام بن ابوحذیفہ، عبداللہ بن حذافہ اور سلیط بن عمرو۔

حضرت عامر بن ابی وقاص اور ان کے ساتھی کم و بیش بارہ برس حبشہ (Ethiopia) میں رہے۔ اس دوران میں بدر، احد اور خندق کی جنگیں رونما ہو چکی تھیں اور صلح حدیبیہ کا تاریخی معاہدہ رقم پا چکا تھا۔ اس زمانے میں سفر و مکاتبت کے اتنے وسائل نہ تھے کہ سب علی الفور مدینہ آن پہنچتے۔ پھر ان کے مابین بحر قلزم (Red Sea) حائل تھا۔ اتنا عرصہ دور رہنے کی وجہ سے ان کی باقی اہل ایمان سے کچھ مغایرت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت جعفر کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس سیدہ حفصہ سے ملنے آئیں تو حضرت عمر نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ حضرت اسماء کا پتا چلنے کے بعد تبصرہ کیا: گویا حبشیہ اور سمندری خاتون ہیں؟ پھر ان سے مخاطب ہو کر کہا: ہم نے تم لوگوں سے پہلے مدینہ ہجرت کی، اس لیے تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہیں۔ حضرت اسماء کو غصہ آ گیا، بولیں: تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ تم میں سے جو بھوکا ہوتا، آپ اسے کھانا کھلاتے اور جو جاہل ہوتا، اس کو دین کی بات سمجھاتے، جبکہ ہم دور دراز، دشمنوں کے ملک حبشہ میں جا پڑے۔ یہ محض اللہ اور اس کے رسول کی رضا مندی کے لیے تھا۔ قسم اللہ کی، مجھ پر دانہ پانی حرام ہے جب تک رسول اکرم سے اس بات کا ذکر نہ کر دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نے (ان کی بات سن کر) فرمایا: حضرت عمر اور ان کے ساتھیوں کی ایک ہی ہجرت ہوئی، جبکہ تم کشتی والوں کی دو ہجرتیں شمار ہوں گی (بخاری، رقم ۴۲۳۰-۴۲۳۱)۔

مدینہ آ کر حضرت عامر بن ابی وقاص نے زقاق حلوہ میں گھر بنایا۔حویطب اور امہ بنت سعدان کے پڑوسی تھے۔

ایک (نوعمر) انصاری صحابی روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازے میں شریک ہوئے۔میت کی تدفین کے بعد لوٹے تو ایک شخص ملا جس نے پیغام دیا کہ یا رسول اللہ، فلاں قریشی عورت نے آپ کی اور صحابہ کی دعوت کر رکھی ہے۔آپ نے دعوت قبول کر لی اور شرکت کے لیے روانہ ہوئے، ہم بھی ساتھ تھے۔راوی کہتے ہیں کہ ہم بچے والدین کے ساتھ بیٹھے تھے کہ کھانا لایا گیا۔آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا، پھر صحابہ نے دیکھا کہ آپ لقمہ چبا رہے ہیں اور نگل نہیں رہے تو انھوں نے بھی ہاتھ روک لیے۔اس اثنا میں سب بچوں کی طرف سے غافل ہو گئے تھے۔ہر کوئی لقمہ پکڑ کر چھوڑ دیتا تھا، سب دیکھ رہے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے ہیں؟ آپ نے لقمہ پھینک کر فرمایا: مجھے لگتا ہے کہ جس بکری کا گوشت ہمارے سامنے رکھا گیا ہے، اس کے مالک سے پوچھے بغیر ذبح کر لی گئی ہے۔تب وہ قریشی خاتون اٹھ کھڑی ہوئی اور کہا: میرا آپ اور صحابہ کی دعوت کرنے کا ارادہ تھا۔میں نے بقیع تک پتا کرایا تو کوئی بکری نہ ملی۔(میرے ہمسایہ) حضرت عامر بن ابی وقاص نے کل ہی بقیع سے ایک بکری خریدی تھی۔میں نے انھیں پیغام بھیجا کہ مجھے بکری نہیں مل سکی، آپ نے جو خریدی تھی وہی بھیج دیں۔میرے بھیجے ہوئے آدمی کی حضرت عامر سے ملاقات تو نہ ہو سکی، البتہ ان کی اہلیہ نے وہی بکری اسے تھما دی۔(یہ تفصیل سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ گوشت قیدیوں کو کھلا دو۔'' (احمد، رقم ۲۲۴۰۷)۔سنن ابوداؤد، رقم ۳۳۳۲ میں یہی واقعہ بیان ہوا ہے، لیکن اس میں حضرت عامر بن ابی وقاص کا نام مذکور نہیں۔روایت کے دوسرے طرق میں وضاحت مذکور ہے کہ میزبان خاتون نے کہا: بکری کے مالک میرے بھائی ہیں اور میں ان کے نزدیک بڑا مقام و مرتبہ رکھتی ہوں۔اگر اس سے بہتر کوئی شے لی ہوتی تو بھی وہ میری مخالفت نہ کرتے۔میری ذمہ داری ہے کہ میں انھیں اس سے زیادہ قیمتی چیز دے کر راضی کر لوں۔آپ نے بکری کا گوشت پھر بھی نہ کھایا اور قیدیوں میں تقسیم کرا دیا (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۱۵۲۸، سنن دارقطنی، رقم ۴۷۱۹)۔ذخیرۂ احادیث میں یہ واحد روایت ہے جس میں حضرت عامر بن ابی وقاص کا ذکر ہے۔خود ان سے مروی کوئی روایت نہیں۔

جمادی الثانی ۱۳ھ میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح دمشق کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ حضرت عامر بن ابی وقاص (دوسری روایت کے مطابق محمیہ بن زنیم) نومنتخب خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب کا خط لے کر وہاں پہنچے۔اس میں

درج فرمان کی رو سے حضرت خالد بن ولید کو معزول کر دیا گیا اور ابوعبیدہ کو شام کا سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا۔ اسی نوعیت کا دوسرا واقعہ ۱۷ھ میں ہوا جب حضرت عمر نے حضرت خالد بن ولید سے قنسرین (Chalcis) کی کمان واپس لینے کا فرمان جاری کیا۔ اس بار تعمیل حضرت بلال نے کی، انھوں نے حضرت خالد کا عمامہ کھولا، وہ ٹوپی اتاری جس پر عمامہ بندھا تھا، پھر عمامے کا طوق بنا کر حضرت خالد کے گلے میں ڈال دیا۔ کارروائی کی نگرانی آرمی چیف حضرت ابوعبیدہ نے کی، اختتام پر انھوں نے حضرت خالد سے معذرت کی اور کہا کہ یہ سب امتثال امر میں تھا۔

حضرت عامر کی وفات عہد فاروقی میں شام میں ہوئی۔ دریاے یرموک (موجودہ نام: شریعۃ المناضرۃ) گولان کی پہاڑیوں کے پاس سے گزرتا ہوا، شام و اردن کی سرحد بناتا ہوا وادئ اردن میں پہنچتا ہے تو اردن کو اسرائیل سے جدا کرتا ہے۔ اس کے جنوب میں واقع شام کی وادئ یرموک (Hieromyax) میں ۸/ رجب ۱۵ھ (۱۵/ اگست ۶۳۶ء) میں اسلامی اور رومی فوجوں کے درمیان ایک تاریخی جنگ ہوئی جسے جنگ یرموک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں حضرت خالد بن ولید کی سالاری میں چھیالیس ہزار مسلمانوں نے دو لاکھ چالیس ہزار رومیوں کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ حضرت عامر بن ابی وقاص اسی معرکہ میں شہید ہوئے۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت عامر کی شہادت موجودہ اسرائیل میں واقع قدیم بستی بیت جبرین (Beit Guvrin) کے قریب مقام اجنادین میں ۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۳ھ (۳۰/ جولائی ۶۳۴ء) میں رومی بازنطینی فوج سے ہونے والی جنگ میں ہوئی جسے جنگ اجنادین کا نام دیا جاتا ہے۔ ذہبی کہتے ہیں کہ جنگ یرموک والی روایت زیادہ صحیح ہے۔ بلاذری نے اجنادین والی روایت کو غلط قرار دینے کے ساتھ ایک شاذ روایت اور بیان کی ہے کہ حضرت عامر فلسطین کی بستی عمواس سے پھوٹنے والی وبا میں طاعون کا شکار ہوئے۔ جنگ میں حضرت عامر بن ابی وقاص کی پوزیشن اور ان کی شہادت کی تفصیل تاریخ کے اوراق میں جگہ نہیں پا سکی۔

حضرت عامر بن ابی وقاص کی قبر دریاے یرموک سے متصل وادئ اردن میں ہے جسے الغور (Ghor) بھی کہا جاتا ہے۔ اردن کا دارالخلافہ عمان یہاں سے دو گھنٹے کے سفر کی مسافت پر واقع ہے۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الروض الانف (سہیلی)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی) اور الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

رضوان اللہ

بعد از موت

—— ۲ ——

تناسُخ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مذاہب کی ایک بڑی تعداد اس بات کو بطور عقیدہ مانتی ہے کہ انسان کی روح خدا کا جز یا اس کا کوئی عکس نہیں اور نہ موت کے بعد یہ اُس میں ضم ہی ہوتی ہے، بلکہ اس کا اپنا ایک مستقل بالذات وجود اور الگ سے ایک تشخص ہے کہ جس کے ساتھ وہ دوبارہ سے زندگی پا لے گی۔ پھر اس بات پر ان میں اختلاف ہے کہ اسے نئی زندگی کب اور کہاں پر ملتی ہے؟ یعنی کیا یہ حادثہ موت کے متصل بعد اور اِسی دنیا میں واقع ہو جاتا ہے یا اس کے لیے کسی خاص وقت اور نئی دنیا کا انتظار ہوتا ہے؟ یہاں پر دو طرح کی آرا ہیں: ایک راے یہ ہے کہ انسانی روح جب جسد خاکی سے جدا ہو جاتی ہے تو اس کو اسی دنیا میں کسی نئے مادی قالب میں پھونک دیا جاتا ہے جو کہ حیوانی بھی ہو سکتا ہے اور نباتاتی بھی[1]۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ اس سے بھی جدا ہو جاتی اور کسی تیسرے قالب میں داخل کر دی جاتی ہے؛ اور یہ سلسلہ ایک خاص وقت تک یونہی چلتا رہتا ہے۔ روح کا اس طرح ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتے چلے جانا، مذہبی اصطلاح میں تناسخ یا آواگون (Reincarnation) کہلاتا ہے۔

تناسخ کی تاریخ

اس عقیدے کا وجود نویں صدی قبل مسیح سے پہلے تقریباً ناپید تھا۔ اس کے بعد کا کوئی دور تھا جب اس کی خام

۱؎ حیوانی یا نباتاتی، ان دونوں میں سے کس کے اندر اس روح کو پھونکا جائے گا، اس بات کا فیصلہ اس کے کرم (اعمال) کرتے ہیں۔

صورتیں مختلف مقامات پر ابھرنا شروع ہوئیں، مگر متعین و معروف شکل میں اس کی پیدایش ایک ہندو گھرانے ہی میں ہوئی۔ ہندوؤں کا تصور دین چونکہ بڑی حد تک دیو مالائی سا ہے، اس لیے یہ گھرانا اس کی پرداخت کے لیے نہایت موزوں ثابت ہوا۔ کچھ زمانہ گزر گیا تو بدھ مت اور جین مت آگے بڑھے، اس کو کچھ سنوارا، کچھ رنگ روپ بدلا اور پھر گود لے لیا۔ تیسری صدی قبل مسیح میں جب بدھ مت مشرقی ایشیا گیا تو اسے بھی اپنے ساتھ لیتا گیا جہاں تاؤ ازم اس کو متبنّٰی کر لینے کے لیے بالکل تیار تھا۔ بعد ازاں، فکر یونان نے بھی مشرق کا اثر قبول کیا تو اس پختہ عمر ہو چکے تناسخ سے ناتا جوڑ لیا اور کسی حد تک اسی کا ہو رہا۔

عقیدۂ تناسخ بن جانے کے وجوہ

تناسخ کی ابتدا کب ہوئی اور یہ کن ادوار اور کن مقامات میں اپنی تکمیل کرتا رہا، یہ سب جان لینے کے بعد اب ہم جائزہ لیتے ہیں کہ محض ایک خیال اور واہمے کے باقاعدہ ایک عقیدے کی صورت میں ڈھل جانے کے آخر وجوہ کیا ہوئے؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہمیشہ جیتے رہنے کی خواہش، اس کی پہلی وجہ ہوئی۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو دنیا کے بارے میں اس کا علم نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے، مگر وقت کے ساتھ وہ بہت کچھ جان لیتا اور یہاں کی چیزوں سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن طرفہ تماشا ہے کہ عین اس وقت جب وہ عقل و دانش کی بلندیوں پر ہوتا اور تجربات کے گراں قدر خزانوں سے مالا مال ہوتا ہے، اس کے قویٰ مضمحل کر دیے جاتے اور سمجھ بوجھ کی تمام صلاحیتیں کند کر دی جاتی ہیں اور آخر کار وہ لمحات بھی آ جاتے ہیں کہ اسے خواہی نخواہی رخت سفر باندھنا اور یہاں سے رخصت ہونا پڑتا ہے۔ اب، ظاہر ہے، کون چاہے گا کہ ایسے ایسے عروج پا کر پھر سے زوال آشنا ہو جائے اور اس بھرے میلے کو الوداع کہہ دے؟ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ وہ اس بات کو مان لینے کے باوجود کہ اسے مر جانا ہے، کبھی مرنا نہیں چاہتا۔ کبھی امرت ڈھونڈتا ہے تو کبھی آب حیات کے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یوں اپنی آرزوؤں کی تسکین کا سامان کیا کرتا ہے[2]۔ تناسخ کا عقیدہ بھی اصل میں کچھ نہیں، اسی طرح کا موہوم سا ایک جتن ہے۔ ایک حشیش ہے جو مست اور بے خود ہو جانے والوں کو دیس نکالا نہیں دیتی، بلکہ ان کے لیے ایک دنیاے خواب بناتی اور انھیں اس میں بسا کر عمر جاوداں بخش

2۔ یہ خواہش ویسے تو بڑی ہی معصوم اور نہایت بے ضرر ہے اور یقیناً پوری بھی کر دی جاتی، مگر اسے پورا کر دینا یہاں کی مجموعی حکمت کے بالکل خلاف ہوتا۔ لہٰذا ہوتا یہی ہے کہ اس طرح کی تمام آرزوئیں لاحاصل رہ جاتی اور اس طرح کے سب خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

دیتی ہے۔

انسان کے ذہن کا افسانوی پس منظر، اس عقیدے کے بننے کی دوسری وجہ ہوا۔ اس کو قدرت کی طرف سے نہایت اعلیٰ درجے کا ذہن عطا ہوا ہے جو اپنی صلاحیتوں کو عمل میں لاتا ہے تو ہزارہا داستانیں تخلیق ہو جاتی ہیں۔ نئی نئی دنیائیں بنتی ہیں کہ جن میں پری زاد کوہ قاف سے اترتی، نقرئی پروں سے اُڑتی پھرتی اور ہر طرف پھول اور ستارے بکھیرتی چلی جاتی ہیں۔ عجیب وغریب جہان آباد ہوتے ہیں کہ جن میں جنات بسیرا کرتے، بدروحیں خون آشام ہو جاتی اور چڑیلیں بے لباس ہو ہو کر اچھل کود کیا کرتی ہیں۔ اس خواب وخیال پر کیا اعتراض تھا اگر یہ سب تفریح پر موقوف ہوتا۔ مگر کبھی کبھی انسان کا جی چاہتا ہے کہ اس کا تخیل ہر سو پرواز کرے اور اس کی جولانیاں دنیوی ہی نہیں، دینی میدان میں بھی اپنا آپ منوائیں۔ چنانچہ اس کی کہانیوں میں دینی خیالات اب باقاعدہ کرداروں میں ڈھل جاتے اور اس کے مذہبی نظریات چلتے پھرتے جسموں میں بدل جاتے ہیں۔ اور یہ تخلیق اپنے کلائمکس کو اُس وقت پہنچتی ہے جب حضرتِ انسان شکلیں بدل بدل کر جانور بن جاتے اور عاجز و بے بس جانور آدمیوں کے روپ میں مارے مارے پھرتے ہیں[3]۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قدیم انسان کا ٹوٹم (totem) کے ساتھ تعلق، اس عقیدے کے بن جانے کی تیسری وجہ ہوا۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک وقت اس پر ایسا بھی گزرا ہے جب اس نے مظاہر فطرت کی خوب پرستش کی ہے۔ اجرام سماوی ہوں یا درخت اور جانور، ان سب کو اس نے پوجا، ان کے سامنے ڈنڈوت کیے، ان کی علامتیں بنا بنا کر ان کو جھکی جبینوں کی نذریں گزرانی ہیں۔ بلکہ حشیش وحشرات اور شمس وقمر کی تو بات ہی کیا، یہ خدا بنانے پر آ گیا ہے تو اس کے توہمات بھی اس کی الٰہیات میں معبود ٹھیرے ہیں۔ مظاہر فطرت کے ساتھ اس حد تک وابستگی اور اس پر مبنی دینی رویہ، اصل میں یہ وہ چیز تھی جس نے بعد از موت زندگی میں بھی اپنی جھلک دکھائی اور اس بے چارے کو ایک ایسے سلسلے میں پرو دیا کہ جس میں یہ کبھی ایک جسم میں ہوتا ہے تو کبھی دوسرے جسم میں؛ اور وہ دوسرا جسم بالعموم، ٹوٹم یعنی نباتات یا پھر حیوانات ہی میں سے ہوتا ہے۔

انسان کی ظلم پر روک لگانے کی اپنی سی ایک کوشش، اس عقیدے کے بننے کی چوتھی وجہ ہوئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خدا نے کائنات اور اس میں رہنے والوں کو اِصلاح کے اصول پر بنایا ہے، مگر یہاں کے باسی چونکہ صاحب اختیار ہیں، اس لیے بعض اوقات اپنی فطرت کو مسخ کر بیٹھتے اور دنیا کو اصلاح کے بجائے فساد اور امن کے بجائے بدامنی سے

۳۔ ستم یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ انسان آپ سوچتا اور آپ ہی کہتا ہے، مگر بے دھڑک دوسروں کو خدا کے نام سے سنا دیتا ہے۔

بھر دیتے ہیں۔ دنیا کو اس کی اصل پر قائم رکھنے کے لیے اب ضروری ہو جاتا ہے کہ فساد اور بدامنی کے ان کاموں پر اخلاقی قدغنیں لگائی جائیں اور ان کے برے نتیجوں سے لوگوں کو متنبہ کیا جائے۔ اس غرض کے لیے، تاریخ شاہد ہے، ہمیشہ سے چلا آتا آخرت کا عقیدہ نہایت مفید بھی تھا اور آزمودہ بھی۔ لیکن انسان ٹھیرا سدا کا جلد باز اور تھڑ دلا! وہ نقد چھوڑ کر ادھار کے چکر میں کیوں پڑتا؟ اس لیے اس کو یہ عقیدہ اس اعتبار سے بے حد ناقص نظر آیا کہ اس میں گناہوں کی سزا اس دنیا میں نہیں دی جاتی، بلکہ اگلی دنیا تک مؤخر کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ جلد بازی کی اسی نفسیات نے اس کو مجبور کیا کہ وہ اصل عقیدے کی نوک پلک درست کرے اور مسئلے کا فوری حل دینے کے لیے تناسخ کا عقیدہ گھڑے۔ سو وہ لوگوں کو ڈرانے لگا کہ اسی کائنات میں کہ جس میں تم ایک دولھے کے مانند زندگی بسر کرتے ہو، اگر جور و جفا سے کام لیا تو نباتات اور حیوانات کی طرح کم ذات اور ذلیل ہو کر رہ جاؤ گے۔ تمھارے دوست احباب اور عزیز واقربا، تمھارے سامنے اٹھکھیلیاں کرتے پھریں گے، مگر تم ہو گے کہ ان کے سان گمان سے بھی دور رہو گے۔ تمھاری حیثیت نظر انداز کیے ہوئے کسی درخت یا کتے کی سی ہو جائے گی۔ انھیں پھل پھول اور گھنا سایہ دینے اور ان کے پیچھے دم ہلانے، حتیٰ کہ ان کے تلوے تک چاٹنے کے باوجود، تم ان کی نگاہِ التفات سے یک سر محروم رہو گے۔ اور اس طرح اذیت بھرا اور بے بسی میں گھرا ہوا تمھارا ایک ایک پل نہ گزرنے والی طویل ترین صدیوں میں بدل جائے گا۔ واضح سی بات ہے کہ انسانی حکمت ظلم و عدوان پر روک لگانے کے لیے اس سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز کوئی اور ڈراوا نہیں بنا سکتی تھی۔ لہٰذا مذہبی پیشواؤں نے اسے خوب استعمال کیا اور عقیدۂ تناسخ کی بنیادیں فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

دنیا میں پائے جانے والے دکھ درد کی غلط توجیہ، اس عقیدے کے بن جانے کی پانچویں وجہ ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں ہر پھول کے دامن میں کانٹے اور خوشی کے پردے میں غم کچھ اس طرح چھپا ہوا ہے کہ ان کو الگ کر دینا کسی کے بس میں نہیں، حالاں کہ اس کے برعکس یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ یہاں کی مسرتیں غموں سے بالکل اجنبی اور پھول کانٹوں سے کوسوں دور ہوتے۔ کہیں ظلم ہوتے نہ ان پر ماتم ہوتے، دکھ ہوتے نہ پھر درد روتے۔ بالخصوص، کم سن بچے تو ہمیشہ سکھی رہتے۔ انھیں دردناک بیماریاں آن گھیرتی نہ بھوک کی سختیاں ستاتی اور نہ ان کے استحصال ہی کی کوئی صورت ہوتی کہ اس معصوم اور بے ضرر مخلوق نے آخر کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ پھر وہ خدا جو انسان کی پیدایش سے لے کر اس کی موت تک ہر ہر مرحلے میں نہایت مشفق اور مہربان رہا، اتنا ظالم کیسے ہو گیا کہ بے گناہوں کو بھی ہر وقت کسی نہ کسی عذاب میں گرفتار کیے ہوئے ہے؟ یہ سوالات تھے جن کا جواب بعض کم سوادوں نے کچھ اس طرح ڈھونڈا کہ کسی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کا دکھوں میں مبتلا ہونا یا مصائب میں گرفتار ہو جانا، حکمت کے خلاف ہے اور نہ اس پر ہونے والا قدرت کا کوئی ظلم ہے، بلکہ یہ سب اس کے پرانے کرموں کے نتائج ہیں، یعنی اگلے جنموں میں جو گناہ اس نے کیے، یہ انھی کا کیا دھرا ہے کہ اِس جنم میں اس کو یہ مصیبتیں اٹھانا پڑ رہی ہیں۔

حقائق سے فرار، چھٹی وجہ ہے جس کے نتیجے میں لوگوں کے ہاں یہ عقیدہ قائم ہوا۔ خدا کا دیا ہوا کھانے اور اچھی طرح برت لینے کے بعد اُس خدا کا شکر، اسی کے سامنے حاضری اور اپنے عملوں کی جواب دہی کا تصور فطری بھی تھا اور عقلی بھی، مگر اس حقیقت کا اِدراک کرنا اور پھر اسی شعور کے ساتھ زندگی گزارنا اُس شخص کے لیے نہایت مشکل تھا جو اپنے منعم اور پروردگار سے بے پروا ہو چکا ہو۔ لٰہذا اس طرح کے حقیقت گریز شخص کے لیے تناسخ کا عقیدہ ہی محفوظ پناہ گاہ تھا جو جواب دہی کے تصور کو تو تسلیم کرتا تھا، مگر خدائی عدالت سے جاں خلاصی کا مژدہ سنا کر اسے عافیت کا ایک گوشہ بھی فراہم کر دیتا تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عقیدۂ تناسخ کی نامعقولیت

اس عقیدے کی پیدایش کے اسباب کوئی سے بھی رہے ہوں، لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کو مانتی اور اس کی بنیاد پر اپنے دین کی وضاحت کرتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اسباب سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ دیکھ لیا جائے کہ خود اس عقیدے میں کیا کسی قدر معقولیت بھی پائی جاتی ہے؟ نیز بعد از موت زندگی کے بارے میں پیدا ہو جانے والے تشکک میں کیا تشفی کا کچھ سامان بھی اس کے ذریعے سے ہو سکتا ہے؟ لیکن اس نظر سے جب اس کا مطالعہ کیا جائے تو انتہائی درجے کی مایوسی ہوتی ہے، اس لیے کہ عقل و فطرت کے معیارات پر پورا اترنا تو بہت دور کی بات، اس پہلو سے متعدد اعتراضات اس پر وارد ضرور ہو جاتے ہیں۔ انھی اعتراضات میں سے ہم کچھ کا ذکر ذیل میں کرتے ہیں:

اولاً، یہ عقیدہ ایک بڑے اہم سوال کا جواب نہیں دیتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں وقوع پذیر ہونے والا کوئی بھی فعل جس طرح کچھ فوری اثرات رکھتا ہے، اسی طرح اس کے بہت سے اثرات دیرپا ہوتے اور کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ایک نیکی اور بدی بسا اوقات صدیوں تک کو متاثر کر دے سکتی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عقیدۂ تناسخ کی رو سے جو کوئی مرتا ہے، اس کے عملوں کی جزا یا سزا اِسی دنیا میں شروع ہو جاتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عمل جو مرنے کے بعد جاری رہتے ہیں، ان کے اچھے نتائج آخر کس کی جھولی میں پڑیں گے اور ان

کے برے نتائج کا ذمہ دار کون شخص ہوگا، بالخصوص اس صورت حال میں کہ جب گناہ کا ارتکاب کرنے والا درخت اور جانور بننے کے چکر سے نکل کر مکتی اور نروان بھی حاصل کر چکا ہو؟

ثانیاً، عمل کا تنوع اور اس میں پائی جانے والی شدت اور نرمی، اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کے نتائج میں بھی تنوع اور درجے کا فرق پایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مختلف انواع کی نیکیوں اور بدیوں میں فرق کیا جاتا اور ان کی جزا اور سزا میں واضح تفاوت رکھا جاتا ہے۔ یہ کیا ہوا کہ عمل کوئی سا بھی اور کسی بھی درجے کا ہو، بدلہ سب کو یہی ملے کہ وہ گھاس اور جانور یا پھر انسان میں بدل دیا جائے۔ عقل عام اور عدل وانصاف کے تقاضے اس طرح کی یکسانیت کو ماننے سے یک سر انکار کرتے ہیں۔ سو تناسخ کے عقیدے میں پائی جانے والی یہ ایسی کمی ہے جو واضح طور پر اس کو نامعقولیت اور صریح ظلم کی طرف لے جاتی ہے۔

ثالثاً، اگر یہ بات صحیح ہے کہ انسان کی روح اس کے برے عمل کی پاداش میں کسی دھتکارے ہوئے بندر، اچھل کود کرتے مینڈک یا رینگتے اور گھسٹتے ہوئے حشرات الارض میں ڈال دی جاتی ہے تو یہ بات ماننا پڑے گی کہ اس نئے روپ اور اس کی یادداشت میں شخصیت، بہرحال انسان ہی کی ہوتی ہوگی، اس لیے کہ یہ نیا روپ اسی طرح تو اس کے جرموں کا بدلہ بن سکے گا؛ اور یہ ایسی معقول بات ہے کہ اہل تناسخ بھی اس کو بعینہٖ تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اس عقیدے میں اس وقت خلا پیدا ہو جاتا ہے جب پلٹ کر یہ سوال کیا جائے کہ کوئی انسان پچھلے جنم میں جانور تھا اور اچھے عملوں کے نتیجے میں انسان بنا دیا گیا تو اس کی یادداشت میں بھی اُسی جانور کی شخصیت اور اس کا شعور، اس وقت موجود کیوں نہیں ہے؟

اس سلسلے میں ایک تاریخی واقعہ بھی سامنے رہے تو مذکورہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے:

ایک مرتبہ ابن فلاس نامی ایک شخص تناسخ کے ماننے والے کسی صاحب کے پاس گئے۔ ان کے سامنے سیاہ رنگ کی ایک بلی تھی اور عام عادت کے مطابق اس کی آنکھوں سے پانی سا بہ رہا تھا۔ وہ صاحب کبھی اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے، کبھی اس کی آنکھوں کو پونچھتے اور پھر ایک دم سے رونے لگتے۔

ابن فلاس نے پوچھا: حضرت، کیا وجہ ہوئی کہ آپ اس طرح روتے ہیں؟

انھوں نے کہا: کم بخت، دیکھتے نہیں ہو کہ جب میں اس کو سہلاتا ہوں تب تب یہ روتی ہے، اس لیے ہو نہ ہو یہ میری والدہ ماجدہ ہیں جو حسرت بھری نگاہوں سے اپنے اس لعل کو دیکھتی اور پھر رونے لگتی ہیں۔

اس کے بعد وہ بلی سے اس طرح ہم کلام ہوئے، جیسے کہ وہ ان کی باتیں خوب سمجھ رہی ہو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ابن فلاس نے سوال کیا: آپ ان سے مخاطب ہیں، کیا یہ آپ کی باتیں کچھ سمجھتی بھی ہے؟

جواب دیا: کیوں نہیں؟

انھوں نے مزید پوچھا: کیا اس کی حسرت بھری آوازیں آپ بھی سمجھ رہے ہیں؟

انھوں نے کہا: بالکل بھی نہیں۔

ابن فلاس فوراً بولے: اگر یہ بلی سب سمجھتی ہے اور آپ کچھ بھی نہیں سمجھتے تو ماننا پڑے گا کہ یہ بلی واقعی کسی وقت میں انسان تھی، مگر آپ بھی ضرور کسی جانور سے بدلے ہوئے ہیں۔

رابعاً، تناسخ دنیا میں موجود دکھوں کی توجیہ یوں کرتا ہے کہ پچھلے جنموں کے یہ ہمارے کرم ہیں جن کا نتیجہ اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں، حالاں کہ ان کی توجیہ اس سے کہیں بہتر انداز میں کی جا سکتی ہے، یعنی یہ ماننے کے بجائے کہ ہم سابقہ زندگی کے برے عملوں کا نتیجہ پا رہے ہیں، یہ کیوں نہ مان لیں کہ ہم اس زندگی میں اسی زندگی کی غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ یا پھر یہ کیوں نہ مان لیں کہ یہاں کے المیے اصل میں المیے ہیں ہی نہیں، بلکہ ہمارے لیے برپا کیے گئے امتحان کا محض ایک جز ہیں۔ واضح سی بات ہے کہ یہ دونوں توجیہات تناسخ کی بیان کردہ توجیہ سے بدرجہا بہتر اور عقل وفطرت کے عین موافق ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خامساً، اگر حقیقت یہی ہے کہ انسانی روحیں درختوں اور جانوروں میں داخل ہوتی اور اچھے عملوں کی وجہ سے انسانی جسموں میں لوٹ آتی ہیں تو سوال اٹھتا ہے کہ دنیا میں انسانی آبادی کے مسلسل بڑھتے چلے جانے کی پھر وجہ کیا ہے؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہر دور اور ہر زمانے میں اس کی آبادی ایک جیسی رہتی یا جو کبھی کم ہوتی بھی تو کبھی زیادہ بھی ہو جاتی، لیکن مسلسل بڑھتی ہرگز نہ چلی جاتی۔ چنانچہ اس صورت حال میں معقول بات یہ نہیں کہ گنی چنی کچھ روحیں ہیں جو لوٹ لوٹ کر آیا کرتی ہیں، بلکہ معقول بات یہ ہے کہ ہر آن نئی ارواح جو تناسخ کے چکر سے قطعی طور پر بے نیاز ہیں اس جہاں میں پیدا ہوتی، نئے انسانی قالب ڈھونڈتی، انھیں اپنا مستقر بنا لیتی، کچھ مدت کے لیے ان میں بسیرا کرتی اور پھر انھیں چھوڑ کر کہیں دور چلی جاتی ہیں۔

سادساً، موت کے بعد نئی زندگی کوئی ایسی شے نہیں کہ جس کا انسانی آنکھ نے مشاہدہ کیا ہو یا اس کی عقل ودانش ہی کبھی اس کا احاطہ کر سکی ہو، اس لیے یہ بات طے ہے کہ اس کے بارے میں اگر کوئی علم حاصل ہو سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف مابعد الطبیعیات کسی ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ عام طور پر اہل مذہب کے ہاں یہ ذریعہ آسمان سے اترنے والی الہامی ہدایت ہے جس میں خدا ہمیشہ سے مافوق الادراک دنیاؤں کی خبر دیتا اور اس نوعیت کے بہت سے

حقائق کو واضح کرتا رہا ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ان باتوں کی وحی وہ سب کی طرف براہ راست نہیں کرتا، بلکہ اس کام کے لیے وہ کسی نہ کسی نمائندے کا انتخاب کرتا ہے۔ لہٰذا عقیدۂ تناسخ پر اس پہلو سے بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ عالم میں کسی خدائی نمائندے نے بھی کیا اس کے بارے میں کبھی کوئی بات کی؟ آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک، کسی ایک ہی نے اس کی طرف دعوت دی ہو یا اِن پر اترنے والی الہامی کتابوں، حتیٰ کہ کسی صحیفے میں اس کا ذکر تک ہوا ہو؟ اور اگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تو بذات خود یہ بات اس عقیدے کی نامعقولیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے اور یہ مانے بغیر چارا نہیں کہ یہ ماوراے طبیعیات وہ دعویٰ ہے جس کے پیچھے محض انسانی کاوش کارفرما ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امین احسن اصلاحی

قرآن کی رو سے ترقی کا مفہوم

سوال: قوموں کے عروج وزوال کی بحث میں قرآن مجید کی رو سے ترقی کا کیا مفہوم ہے؟ اس سے مراد کیا صرف مادی وسیاسی ترقی ہے یا صرف روحانی ترقی یا دونوں؟ جو قوم زیادہ سے زیادہ علاقہ مغلوب کر لے یا مادی وسائل اس کے پاس زیادہ ہوں تو یہ چیز اس کی عظمت کی دلیل بتائی جاتی ہے، بلکہ ایک نظریہ کے مطابق یہ چیزیں ایک قوم کے قابل تقلید ہونے کی دلیل بھی ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جواب: قرآن مجید کی رو سے حقیقی ترقی وہ ہے جو خدا کی بندگی اور اس کے احکام وقوانین کی کامل فرماں برداری و اطاعت کے ساتھ ہو۔ اسی ترقی سے روح اور جسم، دونوں کے حقیقی مقتضیات بروے کار آتے ہیں اور یہی ترقی مشترک طور پر تمام بنی نوع انسان کے لیے رحمت و برکت کے دروازے کھولتی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد ایسی قوموں کا ذکر ہوا ہے جنھوں نے مادی اعتبار سے بڑی ترقی کی، لیکن اپنے دور ترقی میں وہ عذاب الٰہی کی مستحق ٹھہریں، اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی ترقی کے پہلو بہ پہلو انھوں نے روحانی ترقی نہیں کی۔ اس روحانی ترقی سے محروم ہونے کے سبب سے ان کے اجتماعی وسیاسی کردار میں وہ اعتدال وتوازن نہ پیدا ہو سکا جو ایک عادلانہ نظام کے قیام کے لیے ناگزیر چیز تھا۔ اس بنیادی کمزوری کی وجہ سے بہت جلد ان کے اجتماعی وسیاسی کردار میں ایسی خرابیاں نمودار ہو گئیں جن کو قدرت کا نظام زیادہ مدت تک نہیں برداشت کرتا، بلکہ ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد ایسے کردار کی حامل قوموں کو فنا کر دیتا ہے۔

قرآن مجید نے امت مسلمہ کی تشکیل کا جو نظام پیش کیا ہے، اس میں مادی وسیاسی ترقی کو اس نے روحانی ترقی

کے ساتھ بالکل ہم آہنگ رکھا ہے۔اس نے عقائد، عبادات، قانون اور اخلاق کا ایک نہایت متوازن و معتدل نظام بنی نوع انسان کو عطا فرمایا ہے جس کو اختیار کرنے سے وہ حقیقی سعادت یا ترقی حاصل ہو سکتی ہے جو دنیا و آخرت، دونوں کی صلاح و فلاح کی ضامن ہے، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس نظام کے چار جزو ہیں: عقائد، عبادات، قانون اور اخلاق۔ یہ چاروں جز و اس نظام کے اجزاے لاینفک ہیں۔ان میں سے اگر کسی ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو سارا نظام بالکل درہم برہم اور بے برکت ہو کر رہ جائے گا۔ علاوہ بریں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس کے اجزاے ترکیبی میں اخلاق کا جو عنصر شامل ہے، وہ صرف انفرادی یا محدود معاشرتی اخلاق ہی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر وہ اجتماعی و سیاسی اخلاق بھی داخل ہے جو کسی قوم کے عروج و زوال میں اصلی عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس نظام میں عقائد کا جو حصہ ہے، وہ ہم کو زندگی کے بارے میں صحیح نظریات و تصورات دیتا ہے۔ان نظریات و تصورات سے وہ انفرادی و اجتماعی اخلاق وجود میں آتا ہے جو اصل مقصود ہے اور جس پر ہماری دنیوی و اخروی سعادت کا انحصار ہے۔عبادات کا نظام ان نظریات و تصورات کو اور اسی کے ساتھ ساتھ اس اخلاق کو جو ان نظریات سے وجود میں آتا ہے، استحکام اور پختگی بخشتا ہے۔

اگر کسی معاشرہ کی تربیت ٹھیک ٹھیک اسلام کے پیش کردہ اس نقشہ کے مطابق ہو جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے تو وہ دنیا اور آخرت، دونوں میں اس سعادت کا ضامن ہے جو انسان کی تخلیق کی غرض و غایت ہے۔

لیکن اس زمانہ میں مصیبت یہ ہے کہ اسلام کے اس پورے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اگر اس وقت خود مسلمانوں کا جائزہ لیجیے جو اسلام کے حامل ہونے کے مدعی ہیں تو معلوم ہو گا کہ کسی خطہ میں بھی آج ان کی یہ حالت نہیں ہے کہ وہ اجتماعی حیثیت سے پورے اسلام کو اپنائے ہوئے ہوں۔ کچھ لوگوں کے اندر (سب کے اندر نہیں) اگر عبادات کا اہتمام ہے تو وہ اسلام کے قانون اور اس کے نظام اخلاق سے ناآشنا اور محروم ہیں۔عقائد کا حال اکثریت کے اندر یہ ہے کہ عوام کے عقائد پرانی بدعات سے زنگ خوردہ ہو چکے ہیں اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے عقائد کی جڑیں نئی تعلیم نے اکھاڑ کے رکھ دی ہیں۔ اسلامی قانون اور اخلاق کے لحاظ سے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اس کے خال خال اجزا تو ہمارے اندر ضرور پائے جاتے ہیں (وہ بھی زندگی کے بعض خاص دائروں کے اندر)، باقی سارا قانون اور پورا نظام اخلاق ہم نے کتابوں میں لکھ کر کیڑوں کے حوالہ کر رکھا ہے۔

ان حالات کے اندر وہ حقیقی ترقی جو دین و دنیا، دونوں کی فلاح و سعادت کی ضامن ہے، بالکل خارج از بحث ہے۔اس کا مظاہرہ کبھی پہلے مسلمانوں نے کیا تھا اور اب بھی وہی اس کا مظاہرہ کر سکتے تھے، لیکن یہ جب ہو سکتا ہے جب

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وہ اپنے پورے دین کو اپنائیں۔ اس کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ مسلمان نماز اور حج کا اہتمام کر لیں۔

یورپ، امریکہ اور روس وغیرہ ممالک میں آج جو ترقی پائی جاتی ہے، وہ ہے تو اسی اجتماعی و سیاسی اخلاق و کردار کا ثمرہ جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے، لیکن جس طرح ہم مسلمانوں نے اسلام کے بعض اجزا کو لے لیا ہے، بقیہ کو چھوڑ رکھا ہے، اسی طرح ان قوموں نے اجتماعی و سیاسی کردار سے متعلق اسلام کے بعض اجزا کو اپنا لیا ہے اور بقیہ کو چھوڑ رکھا ہے۔ ان کے اندر محنت، وقت کی قدر و قیمت، تلاش علم، شوق جستجو، بلند ہمتی، ایثار، خدمت خلق اور جمہوریت وغیرہ کی بعض وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اسلام کا ورثہ ہیں اور انھی خوبیوں کے نتیجہ میں ان کو موجودہ ترقیاں حاصل ہوئی ہیں، لیکن چونکہ یہ قومیں اسلامی نظام زندگی کی دوسری چیزوں سے محروم ہیں، اس وجہ سے ان کی یہ ساری ترقیاں بنی نوع انسان کے لیے رحمت کے بجائے عذاب بنتی جا رہی ہیں اور ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اب اس عذاب کے پھٹ پڑنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ ان قوموں کی تقلید کی دعوت دیتے ہیں، وہ اگر ان کی ان خوبیوں کی تقلید کی دعوت دیں جو فی الواقع ان کی ترقیوں کا باعث ہوئی ہیں تو میں اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا، یہ خوبیاں تو اسلام کا ورثہ ہیں اور ہمیں سے ان کو ملی تھیں۔ لیکن اگر ان کی تقلید کے معنی ان کی برائیوں اور گمراہیوں میں بھی ان کی تقلید ہے (جیسا کہ فی الواقع ہے) تو اس چیز سے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں، اس لیے کہ ان قوموں کی یہی برائیاں اور گمراہیاں تو ان کی اور ان کے تمام مقلدین کی بربادی کا سبب بننے والی ہیں۔

(تفہیم دین ۱۰۶)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امین احسن اصلاحی

مولانا محمد علی جوہر

فاضل محترم مولانا رئیس احمد جعفری نے مجھ سے فرمایش کی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق میں چند تاثرات قلم بند کروں۔ میں اس فرمایش کی تعمیل کے لیے آمادہ تو ہو گیا ہوں، لیکن یہ بات مضمون کے پہلے مرحلہ ہی میں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مولانا سے صرف نسبت غائبانہ عقیدت ہی کی حاصل ہے، ان سے ملنے جلنے کے مواقع تو درکنار ان کو دور دور سے دیکھ لینے کی سعادت بھی شاید دو تین بار سے زیادہ مجھے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تحریک خلافت کے شباب کے زمانے میں، سن ٹھیک طرح یاد نہیں (غالباً ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں) مولانا مدرسۃ الاصلاح ــــــ سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ یوپی، بھارت ــــــ کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ میں اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں آخری درجوں کا طالب علم تھا۔ اس جلسہ میں مجھے یاد ہے کہ مولانا کا نام سن کر مدرسہ کے وسیع میدان میں بے پناہ خلقت جمع ہوئی۔ مولانا کے ساتھ وقت کے بعض دوسرے اکابر و مشاہیر بھی تشریف لائے میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کسی جلسہ میں کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے، لیکن اس جلسہ میں وہ بھی شریک ہوئے۔ بڑا عظیم اجتماع تھا۔ میں نے اس سے پہلے اس سے بڑا اجتماع کوئی نہیں دیکھا تھا۔ جلسہ کھلے میدان میں تھا۔ ہوا نہایت تند چل رہی تھی۔ اس زمانہ تک لاؤڈ سپیکر کا رواج نہیں ہوا تھا، اس وجہ سے اندیشہ تھا کہ مولانا کی تقریر سنی نہ جا سکے گی جس سے جلسہ میں انتشار پیدا ہو جائے گا، لیکن جب مولانا تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کے رعب و دبدبہ نے ہر شخص کو اس طرح مرعوب و مسحور کر لیا کہ جو شخص جس جگہ کھڑا یا بیٹھا تھا، وہیں پیکر تصویر بن کر رہ گیا! مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بلند اور پرشکوہ آواز ہوا کی تندی اور مجمع کی غیر معمولی وسعت کے باوجود ہر گوشہ میں پہنچنے لگی۔ اور تقریر

کے اثر کا عالم یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو رو نہ رہی ہو۔ یہ مجمع بالکل دیہاتیوں کا تھا، اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت تھوڑے سے تھے۔ ان دیہاتیوں کے لیے مولانا محمد علی جیسے شخص کی کسی تقریر کو سمجھنا کچھ آسان کام نہیں تھا، لیکن ان کی تقریر میں ایمان و یقین کی ایسی گرمی اور سوز و درد کی ایسی گھلاوٹ تھی کہ اس سے متاثر ہونے کے لیے شاید اس کو زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس موقع کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جو قابل ذکر ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر جب ختم ہو گئی تو ہم نے دیکھا کہ مجمع کے ایک کنارے سے ایک بوڑھا دیہاتی اٹھا اور وہ مجمع کو چیرتا پھاڑتا سیدھا سٹیج کی طرف چلا۔ اگرچہ سٹیج تک پہنچنے میں اس کو سخت مزاحمتوں سے سابقہ پیش آیا، لیکن وہ اپنی دھن کا ایسا پکا نکلا کہ اس نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا۔ اور پہنچتے ہی ان کی ڈاڑھی پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص لہجہ میں بولا:

''محمد علی! جو تو نے کیا، وہ کسی سے نہ ہو سکا! یہ کہہ کر جب وہ واپس مڑا تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ 'اس طرح کی داد بھی آپ کے سوا مجھے کسی اور سے نہیں ملی'!''

اس موقع پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا ایک اور پہلو میرے سامنے اپنے استاذ مولانا فراہی کے تاثرات سے واضح ہوا۔ اس جلسہ میں تقریر کر کے مولانا محمد علی اعظم گڑھ شہر کے لیے روانہ ہو گئے جہاں شب میں ان کو ایک جلسۂ عام میں تقریر کرنی تھی۔ وہ گئے تو ان کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح کا سارا جلسہ بھی چلا گیا، یہاں تک کہ خود مولانا فراہی بھی جو مدرسہ کے ناظم تھے، ان کی تقریر میں شرکت کے لیے ان کے ساتھ چلے گئے۔ انھوں نے چلتے وقت ہمیں یہ ہدایت کی کہ کچھ کٹے ہوئے کاغذ اور چند اچھی پنسلیں ان کے سامان میں رکھ دی جائیں تاکہ وہ اعظم گڑھ میں ہونے والی مولانا محمد علی کی تقریر نوٹ کر سکیں۔ یہ معاملہ میرے لیے نہایت حیرت انگیز تھا۔ میں اس بات سے تو واقف تھا کہ مولانا فراہی مولانا محمد علی اور مولانا آزاد سے محبت کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کی تقریر سے مولانا کا اس درجہ متاثر ہونا کہ وہ خود اس کے نوٹ کرنے کا اہتمام کریں، میرے تصور سے مافوق تھا۔ مولانا نہ تو جذباتی آدمی تھے، نہ کوئی سیاسی آدمی۔ وہ ایک محقق، ایک فلسفی اور ایک حکیم تھے۔ وہ، جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، وعظ و تقریر کے جلسوں میں، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے، لیکن مولانا محمد علی کی تقریر میں شریک ہونے کے لیے نہ صرف یہ کہ سفر کے لیے آمادہ ہو گئے، بلکہ ان کی تقریر کے نوٹ لینے کے لیے یہ اہتمام فرمایا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اس اہتمام نے میرے دل میں مولانا محمد علی کی عظمت بہت بڑھا دی۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی ایک عظیم سیاسی لیڈر ہی نہیں، بلکہ وہ علمی و عقلی اعتبار سے بھی ایسے بلند پایہ آدمی ہیں کہ مولانا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فراہی جیسے لوگ بھی ان کی تقریروں کو یہ درجہ دیتے ہیں کہ ان کے نوٹ لیتے ہیں۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مولانا محمد علی کی تقریر میں وہ کیا چیز تھی جس سے استاذ مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے ـــــــ دوسری صبح کو جب مولانا فراہی مدرسہ پر واپس آئے تو منتظمین میں سے بعض نے ان سے دبی زبان سے یہ شکایت کی کہ مولانا محمد علی کے ساتھ ان کے چلے جانے کے سبب سے خود مدرسہ کا جلسہ درہم برہم ہوکر رہ گیا۔ مولانا نے اس کا جواب یہ دیا کہ:

''جو کام کی باتیں تھیں، وہ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہہ دی تھیں، اس کے بعد کسی اور تقریر کی اب کیا ضرورت باقی رہی تھی!''

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات اس اعتماد اور یقین کے ساتھ فرمائی کہ ہر شخص پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو مدرسہ کے جلسہ کے درہم برہم ہوجانے کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہے۔ ان کے نزدیک سننے کی باتیں وہی تھیں جو مولانا محمد علی نے کہہ دی تھیں اور لوگوں نے وہ سن لی تھیں، اس کے بعد جلسہ کا جاری رہنا، ان کے نزدیک، گویا اضاعت وقت کے حکم میں تھا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد متعدد بار مولانا محمد علی کی تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

''محمد علی کی تقریر میں ایمان ہوتا ہے۔''

ایک مرتبہ بطور لطیفہ کے یہ بھی فرمایا کہ:

''چونکہ محمد علی بہت ذہین آدمی ہیں، اس وجہ سے لوگوں کو قرآن کے نظم کی طرح ان کی تقریروں اور تحریروں کے نظم کو سمجھنے میں بھی بسا اوقات زحمت پیش آتی ہے!''

پھر فرمایا کہ:

''کچھ اسی قسم کا حال مولانا محمد قاسم کی تقریروں اور تحریروں کا بھی ہے۔''

اگرچہ بڑوں کے اس ذکر کے درمیان اپنا بیان کچھ مناسب نہیں، لیکن جن کا کل سرمایۂ زندگی صرف وہ چند چھوٹی بڑی نسبتیں ہی ہوں جو بڑوں سے ان کو حاصل ہوئیں، وہ اگر ان کو بیان نہ کریں تو آخر اپنے طرۂ افتخار کی آرایش کے لیے سامان کہاں سے لائیں گے! اس وجہ سے مجھے یہ واقعہ ذکر کرنے کی اجازت دیجیے کہ یہی جلسہ، جس کا اوپر ذکر ہوا، اول اول مجھے پبلک میں روشناس کرانے کا ذریعہ بنا۔ وہ اس طرح کہ مجھے مدرسہ کی تعلیم و تربیت کا نمونہ دکھانے کے لیے مدرسہ کے ذمہ داروں کی طرف سے اس جلسہ میں ایک تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی۔ چنانچہ میں نے اس میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایک تقریر کی۔ یہ تقریر میری اپنی ہی تیار کردہ تھی اور اگرچہ کسی پبلک جلسہ میں یہ میری بالکل پہلی تقریر تھی، لیکن میری عمر اور علم کے اعتبار سے نہایت کامیاب رہی ـــــ مولانا محمد علی اور سٹیج پر بیٹھے ہوئے دوسرے اکابر نے اس کی بڑی تحسین فرمائی، یہاں تک کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے بصلۂ حسن تقریر اپنے تفسیری رسائل کا ایک سیٹ اپنے دستخط سے مزین فرما کر مجھے بطور انعام عنایت فرمایا۔ اس کے بعد مجھے دور دور سے جلسوں کی شرکت کے لیے دعوت نامے ملنے لگے اور میں کبھی کبھی جلسوں میں شریک بھی ہونے لگا، لیکن میں نے یہ لے زیادہ بڑھنے نہیں دی۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے مجھ سے یہاں تک فرمایا کہ زیادہ تقریریں کرنے سے آدمی کا دل سیاہ ہو جایا کرتا ہے! ظاہر ہے کہ جس چیز کو وہ اس درجہ ناپسند فرماتے ہوں، اس کی طرف زیادہ راغب ہونا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

(مقالات اصلاحی ۲/۴۰۱، بہ حوالہ ماہنامہ میثاق لاہور- جولائی ۱۹۶۴ء)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شبلی نعمانی

شہر آشوب اسلام

[ریاست ہائے بلقان نے مل کر ایک ساتھ ترکی پر حملہ کیا تھا۔ اور اس سے ترکی کو جو نقصان عظیم اٹھانا پڑا، اس پر تمام دنیائے اسلام نے خون کے آنسو بہائے تھے۔ ان ہی اشک فشانیوں کے چند قطرات یہ ہیں۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دُھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اُسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر اُن کو دکھائے گا شہید نیم جان کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ اُن کو سنائے گا یتیم ناتوان کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزی طوفان بیدادو بلاتا کے!
یہ لطف اندوزئ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہو گا اس کا امتحان کب تک

نگارستان خون کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی!
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خون چکاں کب تک

یہ مانا گرمئ محفل کے سامان چاہییں تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا قصہ غم سے تمھارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک

عروس بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں!
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبیؔ
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دُھندلے سے نشان زفتگاں ہم ہیں
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوال دولتِ عثمان زوال شرع ملت ہے
عزیز و فکر فرزند و عیاں و خانماں کب تک

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ طیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

پرستاران خاک و کعبہ دنیا سے اگر اُٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قُدسیاں کب تک
جو گونج اُٹھے گا عالم شور ناموش کلیسا سے
تو پھر یہ نغمہ توحید و گلبانگِ اذن کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازہ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اُڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کا آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان و شام و نجد و قیروان کب تک
(دیوان شبلی ۱۲۲-۱۲۵)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org